DATE LABEL

all No. ____________ *Date* ____________

cc. No. ____________

UNIVERSITY OF KASHMIR
LIBRARY



This book should be returned on or before the last date stamped above. An over-due charge of 10/20 Paise will be levied for each day, if the book is kept beyond that date.

Acc: No
23963
31-12-58.

comp,

شاعر ایشیا ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے ادبی، اخلاقی، سوشل اور رومانی افسانوں کا

بہترین مجموعہ

ہچکیاں

اور دیگر افسانے

مترجمہ

از ہر بھگوان صاحب شاد

پبلشرز

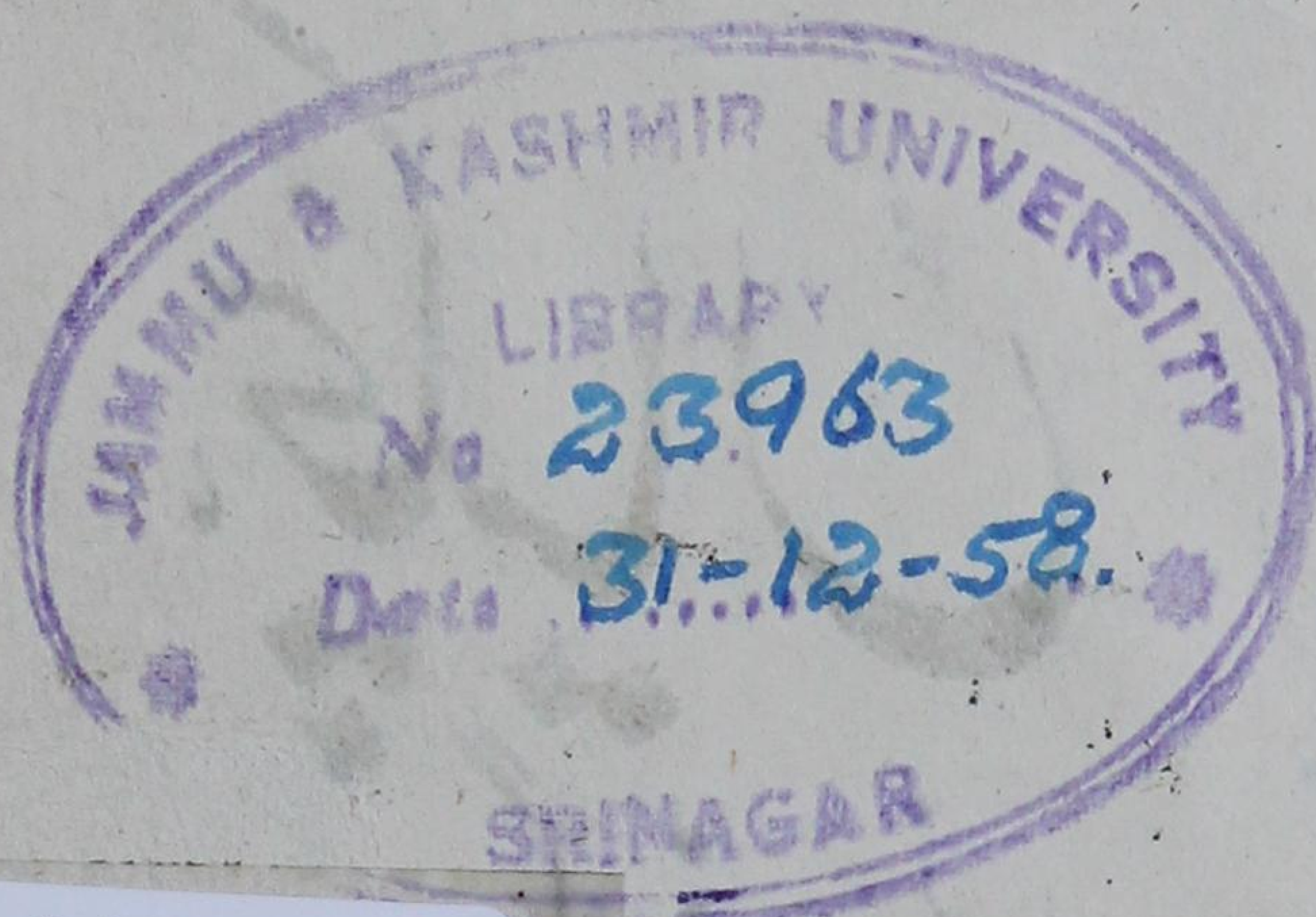
سردار رنجیت سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب

راجہ بازار راولپنڈی شہر

بار اول   حجازی پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد اسمٰعیل پرنٹر چھپوایا   قیمت فی جلد عہ

123
سردار رنجیت سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب
راجہ بازار راولپنڈی شہر

عنوان



U3
012 ش



ALLAMA IQBAL LIBRARY



23963
ST 01
۱۲

فہرس

دیباچہ

پانی بظاہر کتنا پرسکون ہے۔ لیکن اس کا بہاؤ زبردست سے زبردست چیز کو بھی اکھاڑ لے جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک شاعر افسانہ نویس یا ڈرامہ نگار جو بظاہر کتنے سنجیدہ اور نرم طبع کیوں نہ ہوں۔ مگر جب ان کے دل کی پرسکون دنیا میں سے کوئی تازہ یا صدیوں کی دبی ہوئی یادیں ایک جذبات کا طلاطم بپا کر دیتی ہے۔ تو اس وقت پتھر دل بھی مجبوراً کھچے چلے آتے ہیں اس پوتر آتما کی طرف۔ پھول کی خوشبو رہ گزروں کی نگاہیں پھول کی طرف لے جاتی ہے ——— اور ایسے ہی ایک اجڑے ہوئے باغ کے ایک پھول کی خوشبو آن واحد میں ساری دنیا میں پھیل گئی۔ دنیا بھر کے نقادوں نے اپنی عینکوں کو ناک پر ٹھیک طرح رکھ کر دیکھا۔ یہ ٹیگور ہے۔ بنگال کا شاعر اعظم۔ ہندوستانیوں کے لئے قابل صد افتخار۔

صحرائی پھول شہر میں آکر حسینوں کے سر کا سنگار بن گیا۔ وہ گوہر نایاب "گیتانجلی" جس کی پرکھ مسٹر ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس نے کی۔ رجعت نے کتنی دیر تک ٹیگور کے مقبولیت اور نا مقبولیت کے ملے جلے احساسات کے زیر اثر قدر دانوں کی نظر سے چھپا رہا۔ "شاعرات

کو سویا اور صبح اپنے آپ کو دنیا بھر میں مشہور پایا۔

اجڑے ہوئے باغ کے بکھرے ہوئے کانٹوں اور درختوں کی مرجھائی ہوئی ٹہنیوں نے کسی دور دیش سے آنے والے ٹھنڈے اور معطر جھونکے سے اپنے آپ میں زندگی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہیں کیا یہ پھول ہمارے ہی باغ کا ہے؟"

ہونی کی دیوی مسکرا کر بولی۔ "پھول ہمیشہ کانٹوں میں شوبھا دیتے ہیں"

زمانے کے ورق الٹنے لگے۔ اور ہر نئے دن شاعر کے قلم جادو نگار سے نئے خیالات۔ نئے جذبات۔ نئی جدتیں۔ نئے احساسات۔ جیون ساگر کی لہریں بن بن کر مردہ روحوں میں زندگی پھونکتے رہے۔ کبھی نظموں کی شکل میں۔ کبھی کہانیوں کے رنگ میں۔ اور کبھی ڈراموں کے روپ میں ——— ٹیگور کی کہانیاں ایسی ہی ہیں۔ جیسے پانی میں چاند کا عکس بنتا ہے۔ ڈولتا ہے گم ہو جاتا ہے۔ پھر سے بن جاتا ہے۔ سب کچھ لہروں کے رحم پر ہے۔

"شاعر کی شکست" میں شیکھر کے دل ساگر میں کسی دور دیش کے عکس پڑ رہے تھے۔ تہا مخبروں کی چھن چھن سے عکس ڈوبے۔ اور بندھ کیا قابلیت کے غبار نے ان عکسوں کو مٹا دیا...... اور پھر زہر کا پیالہ...... اور پھر اپنا ——— کا شیکھر کے گلے میں

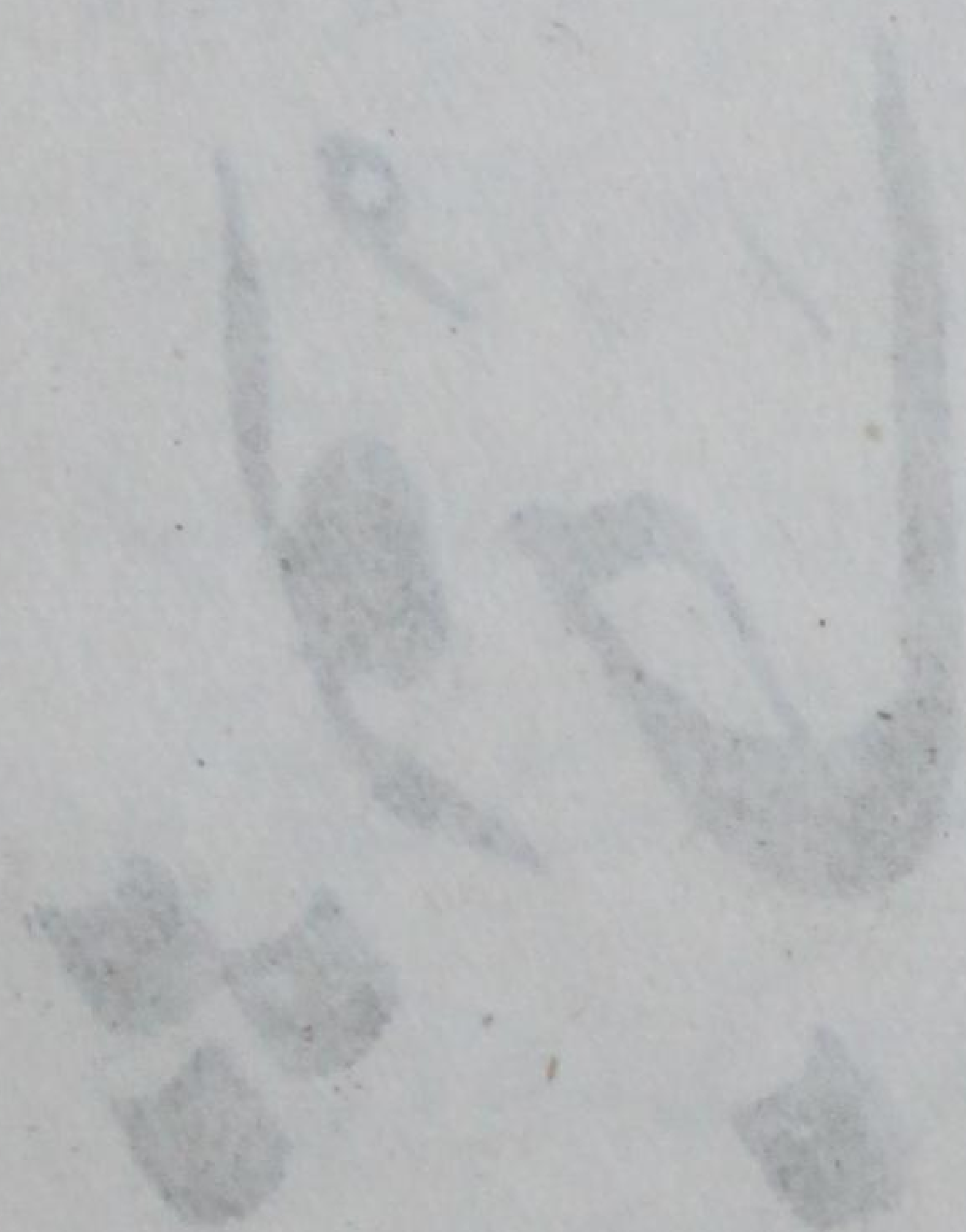
جے مالا ڈالنا۔ شاعر جیون دان دیکر امر ہوگیا۔ فتح شیکھر کی ہوئی عکس پرے
بنگیا۔ ور "شاما" میں شاما کے دل پر کسی گئے پیار کا پرتو پڑا۔ ڈولا اور پھر
مٹ گیا۔ مگر اس کے بعد ۔۔۔ سندر لعل سے شادی ہو جانے کے بعد۔
کئی سالوں کے بعد۔ ایک طوفانی رات میں۔ شاما کی یادیں۔ جیسے پھر سے
بیدار ہو اٹھیں۔ اس کے دل کی دنیا کا مالک کوئی اور تھا۔ سندر لعل نہیں۔
عکس پھر سے بن گیا۔ کسی پتھر کے نیچے دبے ہوئے ولولے کیطرح سر نہ
اٹھا سکتی تھی۔ تو بھی گیا۔ اُن کے دل کا دیوتا ۔۔ کوئی اور تھا۔ موت یقینی
ہے۔ اور اسکا سہاگ موت کے بعد ہوگا ۔۔۔۔۔۔ ویسے ہی کچھ اور
افسانے۔ جو ہر بھگوان صاحب شاد نے اس کتاب کے لئے
ترجمہ کئے ہیں۔ ترجمہ میں کئی ایک مشکلات پیش آتی ہیں مثلاً
اسلوب بیان اور تسلسل کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ تاکہ مصنف کے
حقیقی مطالب کا کہیں خون نہ ہو جائے۔ اور یہ لکھتے ہوئے مجھے
مسرت ہوتی ہے کہ شاد صاحب ان افسانوں کو ترجمہ کرنے میں
بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ آپ ایک جوان سال اہل قلم
ہیں۔ اس سے پہلے وہ "دیوتا" کے مصنف کی حیثیت سے عوام سے
بخوبی روشناس ہو چکے ہیں۔ اور اس امر کے اظہار میں مجھے کسی شک
کی گنجائش نہیں۔ کہ "ہچکیاں" انہیں ایک بہترین مصنف ثابت نہ کرے

(ہر بنس لعل کمار بی۔ اے)

میں اپنی اس کاوش کو اپنے
خاص الخاص کرم فرما
اور مخلص دوست جناب
محمد صادق صاحب نسیم
رام نگری کے نام نامی سے
منسوب کرتا ہوں،

عقیدت کیش
ہر بھگوان شاد

پُوجَا



بدھو لعل نے آپے سے باہر ہو کر کہا، "میں جاتا ہوں"

اس کا باپ بہاری لعل غصے میں بولا "او نا عاقبت اندیش او ناخلف لڑکے، تجھے یہ بات کہتے شرم نہیں آتی۔ ساری عمر تیری جو غور و پرداخت اور نگہداشت کرتے رہے کیا اس کا تو ہمیں اب یہی بدلہ دینا چاہتا ہے"

بہاری لال کے گھر کھانے پینے اور پہننے کے جو رنگ ڈھنگ ہیں۔ انہیں دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لڑکے پر کچھ زیادہ خرچ نہ کرنا پڑا ہوگا، پرانے زمانے کے لوگ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ عبادت الٰہی میں اپنا بیشتر وقت صرف کرتے تھے۔ بہاری لال نے باقی سب باتوں کو چھوڑ کر صرف کھانے پینے اور پہننے میں بڑے بزرگوں کی تقلید کی۔ ایک دن کا بنا ہوا ان کے ہاں چار چار دن چلتا۔

بدھو لعل کا جب تک بیاہ نہ ہوا تھا۔ وہ یہ سب کچھ برداشت کرتا رہا۔ لیکن شادی کے بعد یہ چیز اس کی حدِ برداشت سے باہر ہو گئی باپ کی یہ عادات اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ بڑھیا بوٹ۔ ریشمی کوٹ۔ سونے کی کمانی والی عینک۔ گھڑی۔ چھڑی وغیرہ سامان خریدا جانے لگا۔ اسی بات کے لئے کبھی کبھی باپ سے اس کی بول چال بھی ہو جاتی تھی، اس دوران میں بدھو کی بیوی بہت بیمار ہو گئی۔ حکیم ڈاکٹروں

نے مرض کی تشخیص کر کے بیس روپے کا ایک نسخہ لکھا۔ لیکن بہاری لال نے بیس روپے بتانے والے حکیم کو بیوقوف سمجھا۔ اور باہر کا رستہ دکھایا۔

بدھو پہلے تو باپ کے پاؤں پر گر پڑا۔ لیکن جب وہ نہ مانا۔ تو ٹونک جھونک ہونے لگی۔ مگر سب بے سُود۔ بہاری لال نے حکیم کے بیس روپے والے نسخے کو بنوانے سے انکار کر دیا۔ پھر دوا کے بغیر مریضہ کب تک زندہ رہتی۔ چند دن کے بعد ایک رات اس نے دم توڑ دیا۔

بیوی کے مرجانے کے بعد بُدھو نے اپنے باپ سے کہا "تو ہتیارا ہے۔ تو نے ہی اس بیچاری کی جان لی ہے"

باپ نے کہا "کیا بکتا ہے۔ کیا قیمتی دوا کھا کر کوئی مرتا نہیں۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو یہ امیر لوگ کبھی نہ مرتے۔ تیری ماں مر گئی۔ تیری بہن مر گئی ایسے ہی تیری جورو بھی مر گئی"۔

بدھو اگر اپنے باپ کی اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرتا۔ تو یقیناً اس کے دل کی تسلی ہو جاتی۔ اس گھر میں گھریلو ٹوٹکوں کے سوا کبھی ڈاکٹر یا حکیم سے دوا نہ آئی تھی ——— لیکن آج کل کے لوگ پُرانے ڈھنگ سے مرنا نہیں چاہتے۔ جن دنوں کا یہ واقع ہے۔ انگریزی کو ہندوستان میں آئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ اور اس تھوڑے سے عرصہ میں بدھو پر مغربیت اثر انداز ہو چکی تھی۔ بڈھے باپ سے یہ باتیں سن کر آپے سے باہر ہو کر اس نے کہا "میں جاتا ہوں"

باپ نے برادری کے پنچوں کو بلایا۔ اور بیٹے کو ہمیشہ کے لئے گھر سے جانے کے لیے کہا۔ "آج سے بدھو میرے گھر کے ایک پیسے کا حقدار نہ ہوگا۔ میرے بعد بھی اسے میری جائیداد سے پھوٹی کوڑی تک نہ ملے گی۔"

بدھو نے بھی بڑے طمطراق سے کہا "میں آج سے اپنے باپ کی ایک پائی کا بھی روادار نہیں۔ میں اس کی قسم کھاتا ہوں۔"

بدھو کے چلے جانے کے بعد گاؤں میں لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کوئی کہتا بدھو کو ایسا کرنا واجب نہیں تھا۔ دوسرا کہتا بھئی زمانہ ہی ایسا ہے۔ آجکل بڑے بزرگوں کی پرواہی کون کرتا ہے۔ ایک اور آدمی بولا۔ ایک بیوی کے مرجانے سے اس سے خوبصورت بیوی مل سکتی ہے۔ پہلا بولا لیکن لاکھ سر پٹکنے پر دوسرا باپ نہیں مل سکتا۔

لیکن بہاری لال کو بدھو کے چلے جانے کا قطعاً افسوس نہ تھا۔ افسوس کی بجائے اس کے دل کا بہت سا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ بدھو کی موجودگی میں ہمیشہ اسے یہ خوف دامنگیر رہتا تھا۔ کہ دولت کے لالچ میں کہیں وہ اسے ختم نہ کردے۔ ہاں ایک رنج اسے ضرور ہوا۔ بدھو کا ایک چار سال کا لڑکا نند کمار تھا۔ جاتی دفعہ بدھو اسے بھی ساتھ لے گیا۔ نندو کا خرچ بہت کم تھا۔ اس لئے بہاری لال اسے بہت پیار کرتا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ خیر بہاری لال نے سوچا ان دونوں کے چلے جانے سے ایک مہینے میں اتنا روپیہ بچ گیا۔ سال میں اتنا بچے گا۔

اور اس پر اتنا سُود آئیگا ———— لیکن اس سب کچھ کے باوجود نندو کے بغیر بڈھے بہاری لال کے لیئے اس گھر میں رہنا مشکل ہوگیا۔ آجکل کوئی اس کی پوجا میں دخل نہیں دیتا۔ سوئی کو کوئی خراب نہیں کرتا لکھنے کی دوات کو کوئی چرا نہیں لیتا۔ بغیر ہنگامے کے کھانا سونا باہر جانا بڈھے کے دل کو بیتاب کر دیتا۔ اُسے محسوس ہوا۔ کہ موت کے بعد انسان کو ایسا ہی خوفناک گوشۂ عافیت ملتا ہے۔ خصوصًا بستر کی دری میں قینچی سے کٹے ہوئے سوراخ۔ رامائن کے سرورق پر کالی سیاہی سے بنائی ہوئی تصویر اور بیل بوٹے دیکھکر بہاری لال پاگل ہوا اٹھتا۔ نندو نے اپنی چار سالہ زندگی میں دو تین دھوتیاں ضایع کر دی تھیں۔ اور اس کے لیئے بہاری اسے کئی بار مار پیٹ بھی چکا تھا۔ لیکن اب اس نے سوچا کہ نندو اگر چھ ماہ میں بھی ایک دھوتی پھاڑے تو میں اسے کچھ نہ کہونگا۔ لیکن نندو نہ لوٹا۔

بہاری لعل دن بدن کمزور اور نحیف ہونے لگا۔ دل کے ساتھ ساتھ اُسے اپنے گھر سے بھی نفرت ہوگئی۔ گھر میں اب اس کی طبیعت نہ لگتی تھی۔ دوپہر کے وقت جب لوگ گھروں میں آرام کرتے تو وہ گلیوں اور کوچوں میں پھرا کرتا۔ اسی گاؤں کے ایک شاعر نے بہاری لال کی کنجوسی پر کچھ اشعار کہے تھے۔ جو گاؤں کے بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔ بڈھا جب دوپہر کو گاؤں میں نکلتا۔ تو چھوٹے چھوٹے شوخ بچے اس پر آوازے کستے۔ اُسے

عجیب و غریب ناموں سے پکارتے۔

لیکن کوئی اس کا اصل نام نہ لیتا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا۔ کہ جس دن اس کا نام زبان پر آیا۔ اس دن کھانے کو روٹی نہ ملے گی۔

ایک دن دوپہر کے وقت بہاری لال اپنے باغ میں ایک آم کے پیڑ کے نیچے کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ کہ سامنے اس نے چند لڑکے اپنی طرف آتے دیکھے۔ ان میں ایک لڑکا آگے بڑھا۔ اور ایک پوٹلی سی آگے کرتے ہوئے بولا "بابا جی یہ لو۔ ہنومان جی کا پرشاد۔ آج منگل ہے نا۔ آپ کے لئے لایا ہوں ——"

بہاری لال نے ہاتھ بڑھا کر پوٹلی لے لی۔ اور منہ کے پاس لے جا کر جونہی کھولی۔ تو پوٹلی میں سے دو تین مینڈک پھدک کر باہر آ گئے۔ ایک تو بھاگ گیا۔ لیکن دو بڈھے کی پگڑی میں جا کر کھلبلی مچانے لگے۔ اس تماشہ کو دیکھ سب لڑکے ہنسنے اور تالیاں بجانے لگے۔

بہت دنوں سے بہاری لال سے کسی نے کوئی مذاق نہ کیا تھا۔ آج یہ کھیل دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے لڑکے کو اپنے پاس بلایا۔ لیکن وہ ڈر کے مارے اس کے نزدیک نہ آیا۔ بہت لاڈ۔ چاؤ اور پیار سے جب بہاری نے اسے بلایا۔ تو وہ آ گیا۔

بڈھے نے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے"؟

لڑکے نے کہا "گوکل"

بڈھا۔ "گھر کہاں ہے"۔

لڑکا۔ "یہ نہ بتاؤں گا"۔

بڈھا۔ "باپ کیا کام کرتا ہے"۔

لڑکا۔ "یہ بھی نہ بتاؤں گا"۔

بڈھا۔ "کیوں نہیں بتاؤ گے"۔

لڑکا۔ "میں گھر سے بھاگ کر آیا ہوں"۔

بڈھا ——————————"کیوں"

لڑکا۔ "میرا باپ مجھے مدرسے بھیجنا چاہتا تھا"۔

بڈھا۔ "میرے گھر میں رہو گے"۔

لڑکے نے مان لیا۔ اور بلا جھجک بڈھے کے ساتھ وہ اس کے گھر میں چلا گیا۔ اور وہیں رہنے لگا۔ چند دِنوں میں ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے یہ گھر گوکل کے باپ کا ہے۔ کھانے پینے اور پہننے کے لئے ہمیشہ وہ نئے سے نیا حکم چلاتا۔ بعض اوقات اس کے لئے بڈھے سے اس کی جھڑپ بھی ہو جاتی۔ اپنے لڑکے کو دبا لینا اور بات تھی۔ لیکن یہاں اب پرائے لڑکے سے بہاری لال کو بھی ہار ماننا پڑی۔ گوکل کو بڈھے کے گھر میں اس طرح بڑا دیکھکر گاؤں والوں میں باتیں ہونے لگیں۔ کہ بڈھا اب زیادہ دن زندہ نہیں رہے گا۔ اور مرتے وقت اپنی سب جائداد اس لونڈے کو دے جائیگا۔

سب گاؤں والوں کو گوکل سے اب حسد ہونے لگا۔ اور سب نے اس کی برائی کرنے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن بڈھا ہمیشہ اُسے کلیجے سے لگائے رکھتا کبھی کبھی جب بڈھا گوکل کی کوئی بات ماننے۔ یا کوئی نیا کپڑا سلوا دینے سے انکار کرتا۔ تو وہ چلے جانے کی دھمکی دیتا۔ بڈھا پھر مرعوب ہو کر اس کی بات ان لیتا۔ اور کہتا بھیا میں اپنی ساری جائیداد تمہیں دے جاؤں گا۔

گاؤں کچھ لوگ اس لونڈے کے باپ کا پتہ لگانے لگے۔ وہ کہتے۔ لونڈا کتنا بدمعاش ہے۔ اس کے والدین اس کے لئے رو رہے ہوں گے۔ اور یہ ہے۔ کہ یہاں عیش منا رہا ہے۔ اور پھر اسے گالیاں دیتے۔ لیکن بہاری یا گوکل کسی پر بھی اس کا اثر نہ ہوتا۔

ایک دن ایک آدمی نے بہاری لال سے کہا۔ کہ کل ساتھ والے گاؤں کا ایک آدمی رگھنا تھ اپنے کھوئے ہوئے لڑکے کو ڈھونڈ رہا تھا۔ شاید آج وہ تمہارے ہاں بھی آئے۔ یہ خبر سنتے ہی گوکل کے اوسان خطا ہو گئے وہ بڈھے کی ساری جائیداد کا خیال ترک کر کے وہاں سے بھاگنے کے لئے تیار ہوا۔ لیکن بہاری نے اسے بہت ڈھارس دی۔ اور کہا۔ تجھے ایسی جگہ چھپا دونگا۔ جہاں سے تجھے کوئی ڈھونڈ نہ سکے گا۔ باہر کے آدمی کا تو کہنا ہی کیا۔ اس گاؤں کے لوگ بھی تمہارا پتہ نہ لگا سکیں گے۔

گوکل نے کہا " کہاں چھپاؤ گے "!!

بڈھا بولا۔ اس وقت وہاں جانے سے گاؤں کے ۔۔۔ رگ جان

جائیں گے۔ رات کو وہاں جائیں گے۔

اس نئی دل لگی کو دیکھنے کے لئے چھوکرا بیتاب ہو اٹھا۔ اس نے دل میں سوچا۔ میرا باپ جب مجھے نہ پاکر واپس چلا جائے گا۔ تو لڑکوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے وہاں چھپ جایا کرونگا۔ تو کوئی مجھے ڈھونڈ نہ سکے گا۔ بڑا مزا رہے گا۔

دوپہر کیوقت لڑکے کو گھر میں بند کر کے بہاری چلا گیا۔ اس کے واپس آنے پر چھوکرے نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کہا۔ "چلو اس جگہ"

بڈھے نے کہا۔ "ابھی رات نہیں ہوئی"

گوکل بولا۔ "رات تو ہو گئی دادا چلو اب"

بڈھا۔ "ابھی گاؤں کے لوگ سوئے نہیں"

رات زیادہ ہو چلی۔ گوکل کو نیند آگئی۔ خفیہ جگہ کو دیکھنے کے لئے وہ اپنے آپ کو نیند سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر بھی بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ آدھی رات کے قریب گوکل کا ہاتھ پکڑ کر بڈھا گلی میں آیا۔ ہُو کا عالم تھا۔ قبرستان کی سی خاموشی۔ ایک دو کتے بھونک اٹھے۔ دُور دُور کے اور کتوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ کہیں کہیں درختوں پر پرندوں کے پھڑپھڑانے کی آواز آتی۔ ڈر کے مارے گوکل کا دل دھڑک اٹھا۔ خوف کے مارے بڈھے کا ہاتھ اس نے اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کھیتوں سے نکل کر بڈھا ایک ایسی جگہ پہنچا۔ جہاں کچھ دور تک درختوں اور جھاڑیوں کا جھرمٹ تھا۔

سنسناتی ہوئی ہوا چل رہی تھی۔ رات کی سیاہی میں گھنے درختوں کے پتے نہایت خوفناک دکھائی دے رہے تھے۔ قدم قدم پر خاردار جھاڑیاں تھیں۔ کوئی باقاعدہ رستہ نہ تھا۔ اور اگر تھا بھی تو آمدورفت کم ہونے کے باعث مٹ کر رہ گیا تھا۔ نزدیک ہی سے گیدڑوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

گوکل نے کہا۔ باباجی ابھی کتنا اور دور ہے۔

بڈھے نے کہا۔ بس آ گئے۔

اس جھنڈ سے نکل کر سامنے ایک ٹوٹا پھوٹا مندر تھا۔ دیواریں شکستہ ہو رہی تھیں۔ بڈھے کے بعد گوکل بھی اس میں داخل ہو گیا۔

مندر میں کوئی مورتی وغیرہ نہ تھی۔ گوکل نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ "یہیں کیا بابا"۔ اپنے دل میں چھپنے کے لئے اس نے جو نقشہ بنا رکھا تھا۔ یہ جگہ بالکل اس کے برعکس تھی۔ یہ جگہ دل لگی کے لئے تو نہیں۔ باپ کا گھر چھوڑنے کے بعد گوکل کو کئی بار ٹوٹے پھوٹے مندروں میں راتیں گزارنی پڑی تھیں۔

مندر کے اندر جا کر بڈھے نے ایک پتھر اٹھایا۔ لڑکے نے دیکھا۔ نیچے ایک کوٹھڑی ہے۔ اور اس میں ایک چراغ جل رہا ہے۔ خوف۔ ڈر اور خوشی کے ملے جلے جذبات نے گوکل کے دل کو گھیر لیا۔ سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ بوڑھا نیچے اتر گیا۔ گوکل نے بھی ڈرتے ڈرتے اس کا ساتھ دیا۔

نیچے جا کر دیکھا۔ چاروں طرف پیتل کے کلسے رکھے ہیں۔ وسط میں آسن ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی چندن پھول اور پوجا وغیرہ کا سامان پڑا ہے۔ لڑکے نے جھجکتے ہوئے ایک کلسے کا منہ کھولا۔ دیکھا۔ اس میں روپے اور اشرفیاں پڑے ہیں۔ بڈھے نے کہا۔ گوکل میں نے کہا تھا۔ کہ اپنا سب روپیہ میں تمہیں دے دونگا۔ میرے دوست زیادہ دولت تو نہیں۔ یہ بیس پچیس گھڑے روپوں اور اشرفیوں کے بھرے ہیں۔ یہ سب آج میں تمہیں دے دونگا۔

لڑکا خوشی سے اچھل پڑا۔ اور بولا۔ "ان میں سے تم خود ایک بھی روپیہ نہ لوگے"!

بڈھے نے کہا۔ نہیں۔ لیکن ایک بات ہے۔ کہ اگر میرا کھویا ہوا پوتا نندکمار۔ اس کا لڑکا۔ یا اس کے خاندان کا کوئی بھی فرد آئے۔ تو اسے یہ دولت دینا ہوگی۔

لڑکا سمجھا بڈھا پاگل ہوگیا ہے۔ لیکن پھر بھی کہا۔ "اچھی بات یہ مجھے منظور ہے"!

تب بڈھا بولا۔ "اچھا اس آسن پر بیٹھ جاؤ"!

گوکل "وہ کیوں"!

بڈھا۔ تمہاری پوجا ہوگی۔

لڑکا۔ "کیوں"

بڈھا۔ "ایسا ہی قاعدہ ہے۔"

تب گوکل آسن پر بیٹھ گیا۔ بڈھے نے اسے چندن کا تلک لگایا۔ اس پر سیندور کا ٹیکا دیا۔ گلے میں مالا پہنائی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اس نے کچھ پڑھا۔ اس طرح پوجا کروانے میں لڑکے کو کچھ خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے پکارا۔ دادا۔ لیکن بڈھے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور کچھ گنگناتا رہا۔

بالآخر ایک ایک گھڑا بڑی تکلیف سے بڈھا اٹھا کر اس بچے کے سامنے رکھنے لگا۔ ہر گھڑا رکھتے وقت بڈھا گوکل سے یہ کہلوا لیتا۔

کہ پرتھوی پتی چو لے۔ اس کے لڑکے ماکھن چو لے۔ اس کے بیٹے لچھمن چو لے۔ اس کے لڑکے سمیت چو لے۔ اس کے لڑکے بہاری چو لے۔ اس کے پتر بدھو چو لے۔ اس کے لڑکے نندو چو لے۔ اس کے لڑکے یا اس کے خاندان کا کوئی شخص جو مجھے ملے گا۔ یہ ساری دولت اسے میں گن دونگا۔

بار بار یہ الفاظ دوہراتے ہوئے لڑکا چکرا گیا۔ اس کی زبان رکنے لگی۔ جس وقت یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اس وقت چراغ کے دھوئیں اور دو نو آدمیوں کے سانس سے ایک چھوٹا سا کلسا بھر گیا۔ لڑکے کا حلق سوکھنے لگا۔ ہاتھ پاؤں کے تلووں میں جلن ہونے لگی۔ سانس رکنے لگی۔

چراغ دھیما ہو رہے ہو۔۔۔ اچانک گل ہو گیا۔ اندھیرے میں لڑکے کو ایسا محسوس

ہوا۔ جیسے بڈھوا سیڑھیوں پر سے اوپر جا رہا ہے۔ بیتاب ہوکر وہ چلایا۔ دادا کہاں جا رہے ہو۔ بڈھے نے اوپر سے کہا۔ میں جاتا ہوں۔ تم یہاں رہو۔ یہاں تمہیں کوئی ڈھونڈ نہیں سکتا۔ لیکن یاد رکھنا۔ ہماری لال کا بیٹا بدھولال۔ اس کا بیٹا نند کمار عرف نندو۔ ان الفاظ کے ساتھ فوراً ہی اس نے سیڑھی اوپر اٹھالی۔ لڑکے کی سانس رک رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا۔ دادا میں اپنے باپو کے پاس جاؤنگا۔

بڈھے نے اس بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے پتھر کو پھر اسی جگہ پہ رکھدیا۔ اور کان لگا کر سنا۔ گوکل نے ایک صاف آواز سے کہا دادا۔ پھر دھم سے اس کے گرنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد کچھ سنائی نہ دیا۔

اس طرح گوکل کے ہاتھ اپنی اور اپنے بزرگوں کی کمائی سونپ کر بڈھا اس پر مٹی چھوڑنے لگا۔ مٹی کے اوپر مندر کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے اینٹیں لا کر ڈھیر کر دیا۔ اس کے اوپر گھاس وغیرہ رکھدی۔ رات بہت تھوڑی رہ گئی تھی۔ لیکن بڈھا وہاں سے پلٹ کر نہ جا سکا۔ رہ رہ کر زمین میں کان لگا کر سنتا رہا۔ کہ لڑکا چلاتا تو نہیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے زمین سے بہت گہری تہ میں سے کسی کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ عین اس طرح جیسے رات کے وقت جنگل میں کسی شیر کو دیکھکر کسی کی چیخ و پکار سنکر ساتھ کے گاؤں والے اپنی جان کے خوف سے ادھر نہیں آتے۔ بڈھے نے بھی اس کی کوئی اعتنا نہ کی۔ بڈھے

کو ایسا احساس ہوا۔ جیسے زمین کے نیچے سے گوکل کے رونے کی آواز سب لوگ سن رہے ہیں۔ اور وہ اس طرف دوڑے آرہے ہیں۔ وہ پھر مٹی پر پتھر اور اس کے اوپر اور مٹی ڈالتا چلا جارہا تھا۔ جیسے کہ وہ زمین کے منہ کو بند کرنا چاہتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے وہمی دل کو احساس ہوا۔ جیسے کوئی دادا پکار رہا ہے۔ بڈھے نے مٹی پر ہاتھ پٹاک کر کہا۔ چپ سب لوگ سن لیں گے۔ پھر ایسا ہوا جیسے کسی نے دادا نہ کہا۔

بڈھے نے دیکھا۔ دھوپ نکل آئی ہے۔ ڈر کے مارے وہاں سے نکل کر وہ میدان میں آگیا۔ وہاں جیسے کسی نے پکارا۔ دادا۔

بڈھے نے مڑ کر دیکھا۔ بدھو اس کی طرف آرہا تھا۔ بدھو نے آکر کہا" دادا پتہ لگا لینے سے معلوم ہوا ہے۔ کہ میرا لڑکا تمہارے پاس چھپا ہوا ہے۔

بڈھے نے چونک کر کہا" تیرا لڑکا"

بدھو نے کہا ہاں نندو۔ آج کل ہم لوگ اسے گوکل پکارتے ہیں۔ اور میں نے اپنا نام رگھناتھ رکھ لیا ہے۔ ادھر آس پاس کے سب لوگ آپ کو جانتے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنا نام بدل لیا ہے"

بڈھا دونو ہاتھ پھیلا کر جیسے آسمان کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ ہوش آنے پر وہ بدھو کو مندر کے پاس لے گیا۔ اور پوچھا "رونے کی آواز آتی ہے۔

بُدھو نے کہا "نہیں"۔ بڈھے نے کہا "کان لگا کر سنو۔ کوئی دادا دادا کہہ رہا ہے"۔

بدھو نے زمین کی طرف کان لگا کر سُنا۔ اور کہا۔ نہیں تو۔ اس کے بعد بُڈھا پاگل ہو گیا۔ اور گاؤں کے ہر ایک آدمی سے پوچھتا کیا رونے کی آواز آتی ہے۔ لوگ اس کی بات کو سنتے اور ہنس دیتے۔ نندو کہاں گیا ہے۔ یہ کوئی بھی نہ جانتا تھا۔

ثنا

شناما کیسا تھا ایک ہی سکول میں ہم نے کچھ دنوں پڑھا ہے۔ اور دولہا دولہن کا کھیل بھی اس کے ساتھ کھیلا ہے۔ جب کبھی میں شناماں کے گھر جاتا تو اس کی ماں بڑے لاڈ چاؤ اور پیار سے بیٹھاتی۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھکر وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی اس خوشی کے جوش میں اکثر وہ کہتی کیا ہی اچھی جوڑی ہے۔

گو میری عمر آٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن شناما کی ماں کی ایسی باتوں کے مفہوم کو سمجھ لیا کرتا تھا۔ اس خیال نے میرے دل میں پورے طور سے گھر کر لیا تھا۔ کہ اور لوگوں کی بنسبت شناما پر میرا زیادہ حق ہے۔ اپنے اس دعوے کے گھمنڈ میں میں کبھی کبھی شناما پر حکومت بھی کیا کرتا تھا۔ اور وہ نہایت صبر و استقلال سے میری ہر بات کو برداشت کرتی محلے کے سب لوگ شناما کے گول چہرے۔ اس کے سرخ و سفید رنگ خوبصورت آنکھوں اور سڈول جسم کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن میں ——— ایک اجڈ لڑکا۔ شناما کے حسن کی دلکشی میری نظر میں نہ جچتی تھی۔ میں جانتا تھا۔ کہ میری اور محض میری ہونے کے لیئے شناما اپنے والدین کے ہاں پیدا ہوئی ہے۔

میرے باپ زمیندار کے ہاں خزانچی تھے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ لکھنے میں ہاتھ پکا ہو جائے تو پھر زمیندار کے سر رشتہ کا کام سکھا کر مجھے گماشتوں میں کرا دیں۔ مگر میں دل ہی دل میں اس اسامی کو ناپسند

کرتا تھا۔ میرے پڑوس کا لڑکا کامتا سکول میں انگریزی پڑھکر کلکٹر صاحب کا ناظر ہوگیا تھا۔ اس کی مانند میرے ارادے بھی بلند تھے۔ میں نے دل میں سوچ لیا تھا۔ کہ اگر کلکٹر کا ناظر نہ ہوسکا تو جج کا ہیڈ کلرک ضرور ہی ہوجاؤں گا۔

میں شروع سے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ کہ میرے والد صاحب عدالتوں کے ناظروں اور ہیڈ کلرکوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور ہمیشہ ان کی روپے پیسے۔ سبزی اور دیگر ایسے ہی تحائف سے تواضع کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ عدالتوں کے اردلیوں کو بھی میں قابل عزت خیال کرتا تھا۔ یہ لوگ ہمارے ہندوستان کے قابل پرستش دیوتا ہیں۔ ہندوؤں کے تینتیس کروڑ دیوتاؤں کے چھوٹے چھوٹے ایڈیشن ہیں۔

میں نے دیکھا کہ کامتا کی طرح انگریزی پڑھنے کا یہاں موقع نہیں ہے چنانچہ میں نے اس سے بڑھکر کام کرنے کا ارادہ کیا۔ چھوٹے شہر سے ایکدم بڑے شہر کو بھاگ گیا۔ فتح پور سے الہ آباد پہنچا۔ پہلے اپنے گاؤں کے ایک طالب علم کے ہاں چند روز ٹھہرا۔ جاتی دفعہ میں گھر سے کچھ روپے لے گیا تھا۔ اس لئے خرچ کی تنگی نہ تھی۔ اس کے بعد والد صاحب ماہوار بھیجنے لگے۔ اور میں ایک انگریزی سکول میں داخل ہوگیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ مقامی سبھا سوسائٹیوں میں بھی اٹھنے بیٹھنے لگا۔ اور اب میرا سو فیصدی اعتقاد ہوگیا تھا۔ کہ وطن کے لئے جان دے دینا ہر اہل وطن

فرض ہے۔ لیکن یہ میں نہ جانتا تھا۔ کہ کس طرح اس کارِ مشکل کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ سب کہنے والے تھے کرنے کا بیڑا کسی نے نہ اٹھایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جوش و خروش میں کبھی فرق نہ آیا۔ ہم گاؤں کے لڑکے شہری لڑکوں کی طرح باتوں میں وقت ضائع کرنا نہ جانتے تھے۔ اسی لئے ہم راسخ الاعتقاد تھے۔ ہماری سوسائٹی کے معزز کارکنان لیکچر دیتے تھے۔ ہم لوگ جون جولائی کی دوپہروں کو نوٹس بانٹا کرتے۔ سبھا کے پنڈال میں جہاں پبلک اجلاس کا انعقاد ہوا کرتا۔ ہم دریاں اور کرسیاں بچھایا کرتے تھے۔

ناظر یا ہیڈ کلرک ہونے آیا تھا۔ لیکن منیجری اور گیری بالڈی ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ اس دوران میں میرے والد صاحب شاما کے والد سے صلاح مشورہ کر کے میری شادی کا انتظام کرنے لگے۔ میں پندرہ برس کی عمر میں الہ آباد بھاگ آیا تھا۔ اس وقت شاما کی عمر بارہ برس کی تھی۔ اب اٹھارہ سال کا تھا۔ میرے والد صاحب کے خیال میں میری شادی کی عمر گزری جا رہی تھی۔ لیکن ادھر تہیا کر چکا تھا۔ کہ عمر بھر شادی نہ کروں گا اور اپنی جان قوم اور ملک کے لئے وقف کر دوں گا۔ لیکن والد صاحب کو لکھ بھیجا۔ کہ تعلیم ختم کرنے سے پہلے شادی کرنے کا میرا خیال نہیں ہے اس کے دو چار ماہ بعد مجھے خبر ملی کہ ایک وکیل صاحب کے ساتھ شاما کا بیاہ ہو گیا ہے۔ ان دنوں میں ملک کی بہتری اور بہبودی کے لئے چندہ اکٹھا

کر رہا تھا۔ اس لیئے اس بات کو میں نے ایک بے موقع بات سے زیادہ وقعت نہ دی۔

انٹرنیس پاس ہوگیا۔ ایف۔ اے میں داخل ہوا۔ انہیں دنوں والد صاحب رحلت فرما گئے۔ کنبہ میں میرے علاوہ ماں اور دو بہنیں بھی تھیں۔ لاچار کالج چھوڑ کر مجھے ملازمت کی تلاش کرنا پڑی۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد کاشی کے ایک ہائی سکول میں سیکنڈ ماسٹر کی آسامی مل گئی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا۔ میرے لائق ہی کام ملا ہے۔۔۔۔ طالب علموں کے دلوں میں ایسی روح پھونک دونگا۔ کہ نوجوان ہوکر ہر ایک ملک کی خاطر اپنا تن من اور دھن سب کچھ لٹائے۔ کام شروع کر دیا۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ امتحان کے لیئے لڑکوں کو تیار کرنا ملکی پروپیگنڈے کی نسبت کہیں زیادہ مشکل ہے۔ طالب علموں سے الجبرا جیومیٹری کے سوا اگر کسی موضوع پر بات چیت کی جائے۔ تو ہیڈ ماسٹر صاحب خفا ہوتے ہیں۔ دو اڑھائی ماہ میں میرا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

میرے جیسے آدمی گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر ہزاروں ارادے باندھتے ہیں۔ لیکن میدان عمل میں اترنے پر کندھے پر ہل رکھے ہوئے بیل کی طرح پیچھے سے ڈنڈے کھاتے سر جھکائے سب کچھ سہتے ہیں۔ اور شام کو جو آدھا پیٹ بھوسہ یا گھاس ملتا ہے۔ اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اچھل کود کی ان میں ہمت نہیں رہتی۔

ہنومان گھاٹ کے اوپر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔
وہاں رواں گنگا کے دلفریب مناظر اور صبح کے وقت یاتریوں کی
چہل پہل سے طبیعت کو بہت تسلی ہوتی تھی۔
ابھی تک میں نے ایک بات کو واضح نہیں کیا۔ یہاں کے سرکاری
وکیل پنڈت سندر لعل میرے گھر کے پاس ہی رہتے تھے۔ مجھے
معلوم ہو چکا تھا۔ کہ میری بچپن کی ساتھی شاما انہیں سے بیاہی گئی
ہے۔ اب شاما اسی گھر میں رہتی تھی۔ ایک آدھ بار میں نے اسے گنگا
اشنان کرتے گھاٹ پر جاتے دیکھا تھا۔ پنڈت سندر لعل سے ایک
دن گنگا کے کنارے جان پہچان ہو گئی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا
کہ فتح پور میں میرے ہی محلہ میں ان کے سسرال ہیں۔ لیکن میں نے ان پر
یہ ظاہر نہ کیا۔ کہ شاما بچپن میں میرے ساتھ کھیلی ہے۔ اور پہلے اس کا
بیاہ میرے ہی ساتھ ہونے والا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ شاما کو ایک
طرح سے میں فراموش کر چکا تھا۔
ایک دن سکول میں چھٹی تھی۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے جی اکتا گیا۔ اٹھ کر
وکیل صاحب کی بیٹھک میں چلا گیا۔ باتوں باتوں میں ملک کی ابتری
کا ذکر آ گیا۔ وکیل صاحب ملک کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کوشاں
یا متفکر نہ تھے۔ لیکن یہ موضوع ہی ایسا ہے۔ کہ ہر آدمی اس پر دو چار
گھنٹے بحث کر کے اپنی وطن پرستی کا ثبوت دے سکتا ہے۔ ایسی ہی

باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ بیٹھک کے اندر کے دروازے کے پاس چوڑیوں
کی کھنکار کی آواز سنائی دی۔ میں نے محسوس کیا کہ دروازے کی جھریوں
میں سے دو حیران کن آنکھیں میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ ———
اسی وقت مجھے وہ آنکھیں یاد آگئیں۔ کسی کی یقین۔ عقیدت اور بچپن
کی محبت سے بھری ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں۔ کالی کالی پتلیاں گھنی پلکیں
جیسے بالکل میری آنکھوں کے سامنے آگئی ہیں مجھے ایسا محسوس ہوا
جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں دبا لیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے
لگا۔ مجھے خوف سا بھی ہونے لگا۔ میں گھر لوٹ آیا۔ لیکن ابھی تک وہ
آنکھیں میرے سامنے تھیں۔ لکھنے پڑھنے یا لڑکوں کو پڑھانے میں بھی
جی نہ لگتا۔ دل سے وہ خیال کسی طرح دور ہی نہ ہوتا تھا۔ کلیجے پہ جیسے
کسی نے بڑا بھاری وزنی پتھر رکھ دیا ہو۔ اور جس کے بوجھ سے ایک لمحہ کے
لئے بھی میں بے خبر نہ ہو سکتا تھا۔
شام کے وقت گھاٹ پر جا بیٹھا۔ اور سوچنے لگا ایسا کیوں ہوا۔
دل کے اندر سے جواب آیا تمہاری وہ شاما کیا ہوئی۔
میں نے جواب میں کہا۔ اسے تو میں نے اپنی خواہش سے چھوڑ دیا ہے
کیا وہ میرے لئے ساری عمر بیٹھی رہتی۔ دل میں سے جیسے کوئی بولا۔
اس وقت اگر تم چاہتے۔ تو زندگی بھر کے لئے وہ تمہاری ہو سکتی
تھی۔ تم ہمیشہ کے لئے اسے اپنا بنا سکتے تھے۔ لیکن آج ———

آج اگر تم لاکھ سر پٹکو۔ تو اسے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے
تمہارے ساتھ کھیلی ہوئی شاما ——— تمہارے کتنے نزدیک
کیوں نہ ہو۔ اس کی چوڑیوں کی آواز چاہے تمہارے کانوں میں پڑے
اور تم اسے لاکھ گھور گھور کر دیکھنے کی کوشش کرو۔ لیکن اس سب کچھ
کے باوجود تمہارے اور اس کے درمیان ایک بہت بڑی دیوار
حائل ہے۔ اور حائل رہے گی۔

میں نے کہا۔ اس میں نقصان ہی کیا ہے۔ بھلا شاما میری کون ہے
اور سچ تو یہ ہے۔ کہ شاما میری ہو سکتی تھی۔ وہ میری رفیقہ
حیات اور ...... زندگی کے آخری سانس تک میرے ساتھ
رہ سکتی تھی

لیکن آج ——— آج وہ اتنی دور ہے۔ اتنی غیر ہے۔ کہ اسے
دیکھنا بھی برا ہے۔ اس کے ساتھ بات کرنا بھی گناہ ہے۔ اس کا خیال
کرنا کمینگی ہے۔ اور وہ ——— سندر لعل۔ جسے شاما جانتی بھی نہ
تھی۔ نہ جانے کہاں سے اس کا مالک بن بیٹھا۔ صرف آگ کے پاس
تھوڑی دیر بیٹھ کر چند منتروں کے پڑھنے کے بعد ہمیشہ ——— ہمیشہ
کے لئے اس پر قبضہ جما لیا۔

دنیا میں میں کسی نئی چیز کا پروپیگنڈا کرنا نہیں چاہتا۔ سماج اور اس
کی رسوم کو توڑنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اپنے دلی جذبات کا اظہار

کر رہا ہوں۔ خیالات جو دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیا وہ سبھی پاک ہیں کیا وہ سب ناجائز نہیں۔ اس بات کو میں دل سے کسی طرح دور نہ کر سکتا تھا۔ کہ میرے گھر کی دیوار کی آڑ میں جو شاما رہتی ہے۔ سندر لعل کی نسبت اس پر میرا کہیں زیادہ حق ہے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ کہ اب میرے لئے ایسا سوچنا بھی ناجائز ہے۔ لیکن معاف فرمایئے گا فضول نہیں۔

ان دنوں کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ دوپہر کے وقت کلاس میں لڑکے جب اپنا سبق گنگنا کر یاد کرتے۔ تو باہر بالکل سناٹا ہوتا تھا۔ گرم ہوا کے جھونکوں میں نیند کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک آتی تھی۔ جی چاہتا کیا جی چاہتا تھا۔ یہ تو میں خود بھی نہیں بتا سکتا۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں۔ کہ ان طالب علموں کو جن سے ملک کی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ گو محض قواعد رٹانے کو جی نہ چاہتا تھا۔

سکول سے لوٹ کر گھر آیا۔ تو بیٹھنے کو بھی جی نہ چاہا۔ کسی سے بات چیت کو بھی طبیعت نہ چاہتی تھی۔ ہر وقت دماغ میں ایک الجھن سی رہتی۔ دل چاروں پہر افکار سے گھرا رہتا۔

میں چھت پر گنگا کی طرف منہ کر کے بیٹھا تھا۔ وہاں گھاٹ کا سارا منظر صاف نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی جب طبیعت زیادہ پریشان ہوتی۔ تو گنگا کی پاک وادی کو دھیان میں لا کر افکار سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا

میرا دل مجھ سے کہتا تھا۔ کہ تم شاما کے خاوند ہوتے۔ تو تمہارا بڑھاپا تک آرام سے گزر جاتا۔ تم ہونے چلے تھے۔ مینزی اور گیری بالڈی۔ لیکن انجام کار ہو نہ گیا۔ ایک ہائی سکول کے سیکنڈ ماسٹر ——— اور سندر لال وکیل۔ جنہیں خاص کر شاما کی ضرورت بھی نہ تھی۔ جن کے لئے شادی کے پہلے دن تک۔ جیسے شاما تھی۔ ویسے ہی منی۔ دلاری یا کوئی اور لڑکی تھی۔ آج وہ شاما کے خاوند ہیں۔ وہ شاما کو نہیں چاہتے چاہتے ہیں۔ خدمتگذار بیوی۔ جب کوئی کام بگڑ جاتا ہے۔ تب ڈانٹتے ہیں۔ اور جب خوش ہوتے ہیں۔ تو گہنے بنوا دیتے ہیں۔ وہ موٹے تازے اچکن پہننے۔ اور رہنے۔ کھانے۔ پینے کچہری جانے اور سو رہنے کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ شاما کے روٹھ جانے پر آسمان کے تارے گن کر کبھی انہوں نے رات نہیں گزاری۔

اسی دوران میں پنڈت سندر لعل کو ایک مقدمے کے سلسلہ میں پریاگ جانا پڑا۔ اس دن جیسے میں گھر میں اکیلا تھا۔ شاما بھی اپنے مکان میں شاید تنہا تھی۔

اس دن شاید سوموار تھا۔ صبح سے ہی بادل گھرے ہوئے تھے دو بجے کے قریب پانی برسنے لگا۔ مینہ بڑے زور کا اٹھا۔ بے رنگ ڈھنگ دیکھکر اچھے موسم کی خوشی میں ہیڈ ماسٹر نے سکول میں چھٹی دے دی۔ میں جونہی گھر پہنچا۔ موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ اور ساتھ ہی آندھی بھی

چلنے لگی۔ رات کے وقت آندھی بارش کا زور دن سے چوگنا ہو گیا۔ برسات کی گنگا۔ اڑھائی تین میل کی چوڑائی میں قیامت کا شور مچاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ ایسی بھیانک رات میں سونے کی کوشش کرنا عموماً بے سود ہوا کرتا ہے۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ ایسی بُری رات میں شاما بھی اپنے گھر میں اکیلی ہوگی۔ میں نے سوچا۔ شاما جس گھر میں رہتی ہے۔ وہ پرانا اور بوسیدہ سا ہے۔ اس کی نسبت میرا مکان نیا اور مضبوط بنا ہوا ہے۔ کئی بار دل میں خیال آیا۔ کہ جا کر شاما کو یہاں لے آؤں۔ خدانخواستہ اگر وہ مکان گر پڑا۔ تو ظلم ہو جائے گا۔ میں خود دروازے پر مندر میں سو رہوں گا۔ لیکن ایسے وقت میں اکیلی شاما کے پاس جانے سے میرا دل ہچکچایا۔

آدھی رات گذر گئی۔ ایک بجے کے قریب بارش اور آندھی نے بڑا زور پکڑا۔ میں گھبرا کر دروازے پر آ گیا۔ دروازے پر آتے ہی میں نے دیکھا۔ کوئی عورت پنڈت سندر لال کے گھر سے نکل کر پانی میں اتر رہی ہے۔ دیکھتے ہی میرا عضو عضو کر اٹھا۔ یہ شاما ہے۔ پانی میں اتر کر اس نے پانی میں ڈوبے ہوئے برج کا رخ کیا۔ میرے قدم خودبخود ادھر اٹھنے لگے گھاٹ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ادھر ادھر کی برجیاں صرف ہاتھ ہاتھ دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف آرہے تھے۔ بالآخر دس بارہ ہاتھ کے فاصلہ پر ہم آمنے سامنے ہو گئے۔

وہ گویا قیامت کا وقت تھا۔ اس وقت آسمان پر ستارے نہ تھے۔ زمین کی سب روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ ایک آدھ بات کر لینے میں اس وقت کوئی ہرج نہ تھا۔ لیکن کسی نے کوئی بات نہ کی۔ ایک دوسرے کی خیریت تک نہ پوچھی۔ دیکھتے دیکھتے برجیاں پانی میں ڈوب گئیں۔ پانی ہم دونوں کی کمر تک تھا۔ ہم کھڑے رہے۔

آج ساری دنیا کو چھوڑ کر شاما میرے سامنے کھڑی... ہے۔ وسیع دنیا اور اس کے نشیب و فراز جنہوں نے شاما کو مجھ سے الگ کر دیا تھا۔ کو وہ آج عبور کر لے۔ اس اندھیری رات میں میرے پاس آ گئی ہے۔ بچپن میں اس کلی سے کھیلا تھا۔ اور آج ——— آج یہ پھول بھی میرے پاس تھا۔

اگر اس وقت پانی دو چار ہاتھ اور چڑھ جائے۔ تو ہم دونوں بچپن کی ان بے لوث ملاقاتوں سے دو چار ہو جائیں۔

لیکن نہیں۔ وہ لہر کبھی نہ آئے۔ شاما اپنے خاوند کے ساتھ چین سے زندگی بسر کرے۔ میں اتنی ہی دیر میں قیامت کے ہنگاموں میں گھر کر لطف کے معراج تک پہنچ گیا تھا۔

چار بج گئے۔ پانی بھی آہستہ آہستہ برج سے نیچے اتر گیا۔ شاما کچھ کہے بغیر واپس اپنے گھر چلی گئی۔ اور میں بھی چپ چاپ اپنے گھر واپس آ گیا۔

دل ہی دل میں میں نے کہا۔ میں نہ ناظر بنا۔ نہ سر رشتہ دار۔ اور نہ ہی گیڑی بالڈی یا منیزی بن سکا۔ میں ہوں۔ ایک سکول کا سیکنڈ ماسٹر میری اس زندگی میں بہت تھوڑے وقت کے لئے پُرنور رات آئی تھی۔ اپنی زندگی کے سب دنوں میں سے میں محض ان چند گھڑیوں کو سب سے بہترین خیال کرتا ہوں۔

چتا کی آگ

رادھا اور منگل ندی کے کنارے ٹوٹے ہوئے مندر میں ملے۔ رادھا نے زبان سے کچھ نہ کہہ کر سنجیدگی کے جذبات سے منگل کی طرف دیکھا گویا اسے ڈانٹ رہی ہو۔ اس کا مطلب یہی تھا۔ کہ کس ارادے سے آج تم مجھے یہاں بلا آئے ہو۔ میں نے آج تک تمہاری سب باتیں سنی ہیں۔ اس سے کیا تمہیں ایسی ہمت ہوگئی ہے۔

منگل یوں بھی رادھا سے کچھ ڈرتا تھا۔ اور اب رادھا کی سنجیدگی سے وہ اور بھی ششش و پنج میں پڑگیا۔ اس نے سوچا تھا۔ کہ حال دل ایک بہت لمبی چوڑی تمہید کے بعد رادھا پر ظاہر کروں گا۔ لیکن اب اسے یہ خیال ترک کرنا پڑا مگر بلا کر لانے کی وجہ بتائے بغیر بھی بات نہیں بنتی۔ منگل جلدی سے کہہ اٹھا۔ میں کہتا ہوں۔ کہ ہم دونوں یہاں سے بھاگ جائیں۔ اور دور کسی اور شہر میں جا کر شادی کرلیں۔

منگل جو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ تو اس نے ٹھیک ٹھیک کہدیا لیکن اس کے ساتھ جو میٹھی میٹھی تمہیدی باتیں کرنے کا ارادہ تھا۔ وہ پورا نہ ہوسکا۔ منگل کی یہ بات بالکل پھیکی اور عجیب سی معلوم ہوئی بات تو منہ سے نکال دی۔ لیکن سٹپٹا سا گیا۔ اب دو چار ادھر ادھر ادھر کی باتیں کہہ کر رادھا کو راضی کرنے کی اس میں طاقت نہ تھی۔ ندی کے کنارے ٹوٹے ہوئے مندر میں دوپہر کے وقت رادھا کو بلا کر بااسوقت منگل صرف یہی کہہ سکا۔ کہ چلو شادی کرلیں۔

رادھا - گھنیا لال کی بیٹی تھی عمر ہو گی چوبیس کے قریب - جیسی عمر
ویسی ہی بھرپور جوانی ہے - شام کی شفق کی مانند چمکیلا رنگ -
چونکہ اس کا باپ مر گیا تھا - اس لئے بڑے بھائی کے پاس رہتی تھی
اس کا نام تھا سکھدیو -

بھائی بہن دونوں کا مزاج ایک سا ہے - دونوں کم گو ہیں - لیکن
ان کے چہروں پر جلال ہے - جو دوپہر کی طرح چلچلاتا ہے - لوگ
سکھدیو سے بہت ڈرتے ہیں -

منگل دوسری جگہ کے رہنے والا ہے - لیکن رادھا کے گاؤں میں
وہ پچھلے پندرہ سال سے رہتا تھا - گاؤں کانپور سے میل بھر کے
فاصلہ پر ہے - یہاں چارے کی بہتات دیکھ کر ایک صاحب نے
ڈائری کھولی تھی - منگل کا باپ وہیں نوکر تھا - باپ کے مر جانے
پر بیٹے کو صاحب کا سہارا ملا - صاحب کی ہی مہربانی سے وہ اتنا
بڑا ہوا تھا - اور اب اسی ڈائری میں کام کرتا تھا - جس وقت کی یہ بات
لکھی جا رہی ہے - اس وقت یورپین صاحب لوگوں کی ایسی مہربانیوں
کی کئی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں - منگل کے پاس صرف اس کی بیوہ
بوا ہے - منگل سکھدیو کا پڑوسی تھا - رادھا اور منگل دونوں لڑکپن
میں ساتھ کھیلے تھے - منگل کی بوا رادھا کو بہت پیار کرتی تھی
منگل کی عمر بھی اٹھارہ انیس کے قریب ہو گی - بوا کے لاکھ کہنے

پر بھی وہ بیاہ کے لئے راضی نہ ہوا۔ صاحب بہادر ایک ہندوستانی چھوکرے کی ایسی عقل دیکھ بہت خوش ہوئے۔ وہ سمجھے کہ منگل محض انہیں ہی اپنی زندگی کا معراج بنانا چاہتا ہے۔ صاحب خود بھی اس وقت تک کنوارے تھے۔ اس دوران میں منگل کی بوا مر گئی ادھر ہاتھ تنگ ہونے کے باعث سکھدیو رادھا کا بیاہ بھی نہ کر سکتا تھا۔

ناظرین کو یہ بتانے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ کہ بیاہ کے دیوتا نے ان دو دلوں کو ایک ہی لڑی میں پرونے میں لاپرواہی کا اظہار کیا۔ تھا لیکن اس کے برعکس محبت کے دیوتا نے اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کی۔ بوڑھے برہما جس وقت اونگھ رہے تھے۔ اس وقت کیوپڈ اپنا کام ہوشیاری سے کر رہا تھا۔

کام دیو کا اثر جدا جدا لوگوں پر جدا جدا ڈھنگ سے پڑتا ہے۔ کام دیو کا بہکایا ہوا منگل اپنے دل کی دو چار باتیں کہنے کے لئے موقع ڈھونڈھتا پھرتا تھا۔ لیکن رادھا اسے ایسا موقع نہیں دیتی اس کی سنجیدگی منگل کے دل میں ایک طرح کا خوف سا پیدا کر دیتی ہے۔

آج سینکڑوں قسمیں کھا کر منگل رادھا کو اس مندر میں لا سکا ہے اس نے سوچا تھا۔ کہ جو کچھ کہنا ہے۔ آج سب کچھ کہہ دونگا۔ اس

کے بعد زندگی یا تو مزے سے کٹے گی۔ یا جان دے دوں گا۔ اور پھر موقع پاتے ہی اس نے کہدیا۔ چلو شادی کر لیں۔

اس کے بعد اس طالب علم کی طرح جسے اپنا سبق یاد نہ ہو۔ وہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ رادھا کو جیسے امید ہی نہ تھی۔ کہ منگل ایسے ایسی بات کہے گا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے چپ رہے۔

دوپہر کا منظر بھی بہت دلفریب ہوتا ہے۔ اور پھر سنّاٹا سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ دوپہر کے بہت سے واقعات میں قدرت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہوا لگنے سے مندر کا ایک خستہ حال دروازہ کسی مایوس انسان کی طرح آہ و فغاں کرتا ہوا کھلنے اور بند ہونے لگا۔ مندر کی شکستہ دیواروں پر جنگلی کبوتر غٹر غوں غٹر غوں کر رہے تھے۔ باہر سیمر کے درخت پر لکڑ ہی کھانے والا پرندہ اپنی لمبی چونچ سے کھٹ کھٹ کر کے درخت کو کریدنے لگا۔ سوکھے پتوں کے ڈھیر میں سر سر کرتا ہوا گرگٹ ادھر سے ادھر نکل گیا۔ میدان کی طرف گرم ہوا کے جھونکے آکر سب اشجار کے پتوں کو جنبش میں لانے لگے۔ ندی کا پانی یکدم تیزی میں آکر گھاٹ کی سیڑھیوں سے ٹکرانے لگا۔ اس منظر میں کسی کی بانسری کی پُر درد آوازوں پر ایک خاص انداز سے اثر انداز ہو رہی تھی۔ منگل کو رادھا کے چہرے کی طرف دیکھنے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ مندر کی دیوار کے سہارے

اسی طرح سنجیدگی سے سامنے کی ندی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے محو خواب ہو۔

کچھ دیر کے بعد ادھر سے منہ پھرا کر منگل نے نہایت عجز و انکساری سے رادھا کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالیں۔ رادھا نے سر ہلا کر کہا۔ نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

رادھا کے ان الفاظ نے منگل کی تمام تر امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ اس پر اچھی واضح تھا کہ رادھا کی نہیں۔ کو ہاں میں بدلنا ٹیڑھی کھیر ہے۔

اس نے اپنے دل میں کہا۔ اپنی اونچی ذات کا خیال کر کے مجھ سے نیچی ذات کے براہمن سے وہ کبھی بھی شادی نہیں کرے گی۔ پیار کرنا اور بات ہے۔ لیکن شادی کرنا اور چیز ہے۔

رادھا نے سوچا۔ کہ میرے سوچ سمجھ کر کام نہ کرنے اور اس سے کھلی باتیں کرنے سے آج اسے ایسی ہمت ہوئی ہے۔ وہ اسی لمحہ مندر سے جانے لگی۔

حالات نازک دیکھکر منگل بولا۔ میں کل ہی یہاں سے جانے والا ہوں۔

رادھا نے جیسے یہ جذبہ دکھانے کی کوشش کی۔ کہ جا رہے ہو تو مجھے کیا۔ لیکن اپنی کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ آہستگی

سے پوچھا کیوں۔
منگل نے کہا۔ صاحب ولائیت جا رہے ہیں۔ اس لئے میں بھی نوکری چھوڑ کر کلکتہ یا بمبئی چلا جاؤں گا۔ چند لمحات تک رادھا چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس نے سوچا۔ وہ اس کشتی میں سوار ہو کر اس راہ پر نہیں جا سکتی۔ جس پر منگل اسے لے جانا چاہتا ہے۔ پھر بڑے شیریں انداز میں بولی۔ اچھا۔
منگل کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے رادھا کے اس ایک لفظ "اچھا" میں ایک بڑی آہ پوشیدہ ہے۔ رادھا جانے لگی۔ کہ اچانک منگل نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سکھدیو جی۔
رادھا نے مڑ کر دیکھا۔ سکھدیو انہیں کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا۔ کہ بھیا کو اس کے یہاں آنے کی خبر مل گئی ہے۔ یہ آفت دیکھ کر منگل نے مندر کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے کودنے کا ارادہ کیا۔ لیکن رادھا نے اس کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ کر اسے روک رکھا۔
سکھدیو مندر میں داخل ہوا۔ دونوں کی طرف غور سے دیکھا رادھا نے منگل کی طرف دیکھ کر کہا۔ تمہارے ہی گھر آؤنگی۔ تم میری راہ دیکھنا۔ سکھدیو مندر سے باہر نکلا۔ اس نے ایک شعلہ بیان اور آتش خیال مصنف کی مانند رادھا کی طرف دیکھا۔ رادھا چپ چاپ اس کے پیچھے چلی۔ منگل یکا یک وہیں کھڑا رہ گیا۔ جیسے اُسے

پھانسی کا حکم ہو گیا ہو۔

اسی رات کو سکھدیو نے ایک ہلدی رنگی پیلی دھوتی لا کر رادھا کو دی۔ اور کہا اسے پہن لو۔ تھوڑی دیر بعد رادھا اسے پہنکر آ گئی اس کے بعد حکم ہوا میرے ساتھ آؤ۔

سکھدیو کا اشارہ بھی ہمیشہ حکم کی طرح مانا جاتا تھا۔ رادھا بھی اسے ٹال نہ سکی۔ اسی رات دونوں بہن بھائی گنگا کے کنارے کی طرف چلے۔ گھاٹ گاؤں کے نزدیک ہی تھا۔ گنگا کے کنارے۔ شمشان بھومی کے نزدیک ہی ایک کوٹھڑی میں ایک ضعیف العمر برہمن اپنی زندگی کے آخری سانس گن رہا تھا۔ اس کے پلنگ کے پاس جا کر سکھدیو کھڑا ہو گیا۔ رادھا اس کے ساتھ تھی۔ پوتھی پترہ لئے وہیں پر پروہت بھی موجود تھے۔ سکھدیو نے انہیں اشارہ کیا۔ وہ پہلے ہی اس کارنیک کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ رادھا کو معلوم ہوا۔ کہ اس چند گھڑیوں کے مہمان سے اس کی شادی ہو گی۔ لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ پاس ہی دو جلتی ہوئی چتاؤں کی روشنی میں اس کوٹھری میں رادھا کا بیاہ ہو گیا۔ ایک طرف بڈھا موت کا انتظار کر رہا تھا۔ اور دوسری طرف پروہت اسے اپنے منتروں کے زور سے اسے رادھا کا خاوند بنا رہے تھے شادی کے دوسرے ہی دن رادھا بیوہ ہو گئی۔ اس المناک

واقع سے رادھا کو رتی بھر افسوس نہ ہوا۔ اور منگل بھی رادھا کے بیوہ ہونے کی خبر سن کر حیران یا رنجیدہ نہ ہوا۔ جتنا تعجب اُسے بوڑھے کی شادی کی خبر سن کر ہوا تھا۔ منگل کو اس خبر کی سچائی میں کچھ شک سا ہوا۔ لیکن جلدی ہی رفع ہو گیا۔

اسے خبر ملی شمشان میں بڑی بھیڑ ہے۔ رادھا ستی ہو گی۔ اس خبر نے منگل کے دل کو چور چور کر دیا۔

اس نے سوچا کہ جا کر اپنے صاحب سے سب حال کہدے۔ اور ان کی امداد سے رادھا کو ستی ہونے سے بچوا لے۔ لیکن پھر خیال آیا۔ کہ صاحب تو سویرے ہی موٹر میں سوار ہو کر کانپور چلے گئے ہیں۔ صاحب بہادر نے منگل کو بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ لیکن وہ نہ گیا تھا۔

رادھا نے منگل سے کہا تھا۔ میں تمہارے ہی گھر آؤں گی۔ میری راہ دیکھنا۔ لیکن اب منگل کو اس کی امید نہ تھی۔ کہ رادھا کو وہ اپنی بیوی بنا سکے گا۔ لیکن یہ خواہش ضرور ہے۔ کہ اسے ایکبار دور سے دیکھ لے۔ اور اگر ہو سکے۔ تو اُسے کچھ امداد پہنچائے۔ رادھا کے بیوہ ہونے کی خبر سن کر منگل نے سوچا تھا۔ کہ کیا بیوہ کی شادی نہیں ہو سکتی۔ ایکبار کانپور میں اس نے ودھوا وواہ کے حق میں بہت سی باتیں سنی تھیں۔ پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ رادھا اس بات

پر کبھی راضی نہ ہو گی۔ لیکن منگل کے کانوں کے نزدیک جیسے پھر کسی
نے کہدیا۔ میں تمہارے گھر آؤں گی۔ میری راہ دیکھنا۔
ان حالات میں وہ رادھا کے ستی ہونے کی خبر سن کر پاگل سا ہو گیا۔
اس نے پرتگیا کی کہ یا تو رادھا کو بچا لے گا۔ یا اپنی جان دے دوں گا۔
اسے یقین تھا۔ کہ اپنی خواہش سے رادھا ستی نہیں ہو رہی ہے۔
شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ کہ اچانک آسمان پہ بادل محیط
ہو گئے۔ تند و تیز آندھی چلنے لگی۔ آن کی آن میں موسلادھار بارش
ہونے لگی۔ آندھی ایسے زور سے تھی۔ کہ منگل سوچنے لگا۔ مکان کا
چھت ٹوٹ پڑے گا۔ اس کے دل کے حشر خیز ہنگامہ کی طرح
باہر بھی آندھی طوفان بپا کر رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے
ساری قدرت اس کے خلاف جد و جہد کر رہی ہے۔
اسی وقت باہر سے کسی نے دروازے کو دھکا دیا۔ منگل نے
اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ایک عورت اندر گھس آئی۔ اس کے سارے
کپڑے بھیگ رہے تھے۔ کپڑے سے اس نے اپنا سارا منہ
چھپایا ہوا تھا۔ منگل نے چال سے پہچان لیا۔ وہ رادھا تھی۔
نہایت نرم لہجہ میں بولا۔ رادھا تم چتا پر سے بھاگ آئی ہو۔
رادھا نے کہا۔ ہاں میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ کہ میں تمہارے
گھر آؤں گی۔ لیکن منگل اب میں وہ رادھا نہیں ہوں۔ میرا سب کچھ

بدل گیا ہے۔ پوہو...... کیا مجھے اپنے گھر میں رکھ سکتے ہو۔ ساتھ ہی تمہیں یہ پرتگیا کرنی ہوگی۔ کہ کبھی تم مجھے گھونگھٹ اٹھانے کے لئے نہ کہو گے۔

منگل بولا۔ جو تم کہو گی۔ وہی کروں گا۔ میں تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔

راوھا نے کہا۔ تو چلو اب ہمارا ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔

گھر میں جو کچھ تھا۔ اسے ویسے ہی چھوڑ کر منگل چل دیا۔ آندھی اتنے زور کی تھی۔ کہ پاؤں ٹکا کر ایک جگہ کھڑا ہونا ناممکن تھا۔ آندھی کی لپیٹ میں آئی ہوئیں چھوٹی چھوٹی کنکریاں چھرّوں کی طرح لگتی تھیں۔ سر پہ کوئی درخت نہ ٹوٹ پڑے۔ اسی لئے منگل نے میدانی راہ پکڑی ہوا پیچھے کی طرف سے آگے کو دھکیل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آندھی ان دونوں کو اُٹھا کر دوسری دنیا میں لے جانا چاہتی ہے۔

ناظرین اس کہانی کو من گھڑت یا طبع زاد نہ سمجھیں۔ جن دنوں ہندوستان میں ستی کی رسم عام تھی۔ اور ہر بیوہ کے لئے ستی ہونا لازمی تھا۔ ان دنوں ایسے واقعات عام ہوا کرتے تھے۔ جس پر شادی کا کوئی دن نہ ہوا ہو۔ جس نے اپنے مرحوم خاوند کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا ہو۔ وہ بھلا اپنی جان کو خواہ مخواہ کیونکر نذر آتش کر جاتی ہے۔

راوھا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر چتا پر بٹھایا گیا اور آگ لگا دی گئی۔

آگ کے شعلے چند ہی لمحوں میں آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ عین اسی وقت
تند وتیز آندھی اور موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ اس دوران میں رادھا
کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں جل چکی تھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں کھل چکے تھے
رادھا نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ جگہ جگہ سے جلی ہوئی
دھوتی سے اپنے جسم کو ڈھانپتی ہوئی رادھا اپنے گھر پہنچی۔ سکھدیو
اس وقت گھر میں نہ تھا۔ شاید رادھا کے مرسم پتی کے ہاں گئے تھے
صندوق کھول کر اس نے دوسری دھوتی نکال کر پہنی۔ پھر شیشہ لے کر
اپنا منہ دیکھا۔ اس کے بعد شیشے کو زور سے زمین پر پٹک کر اس نے
کچھ سوچا۔ پھر گھونگھٹ سے منہ ڈھانپ کر وہ منگل کے گھر چلی گئی
اس کے بعد جو ہوا آپ جانتے ہیں۔

منگل نے کانپور جا کر ایک مہاجن کی ملاقات کرلی۔ اور وہیں ایک
چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے کر رادھا کے ساتھ رہنے لگا۔ اس میں کوئی
شک نہیں کہ رادھا ——— منگل کے پاس تھی۔ لیکن منگل کو کوئی سکھ
حاصل نہ تھا۔ زیادہ نہیں دونوں کے درمیان گھونگھٹ کی ایک دیوار حائل
تھی۔ لیکن وہ گھونگھٹ منگل کے دل پر موت کا سا اثر کرنے والا تھا
کیونکہ مایوسی محض عنایت ہوتی۔ دکھ اور تکلیف کو بانسے دھان رکھتی
ہے۔ لیکن اس گھونگھٹ کے ہونے سے ہمیشہ منگل کے دل میں ایک صدمہ
سا رہتا۔

ایک تو رادھا پہلے ہی خاموش۔ سنجیدہ اور کم گو واقع ہوئی تھی۔ اس
کے گھونگھٹ نے اور بھی سناٹا کر دیا۔ وہ سناٹا منگل کو نہائیت خوفناک
معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو موت سے گھرا ہوا خیال کرتا تھا۔
موت کا سایہ سناٹا منگل کو اندر ہی اندر گھن کیطرح کھائے جا رہا تھا۔ منگل
پہلے جس رادھا کو جانتا تھا۔ وہ تو اس کے ہاتھ سے نکل ہی گئی۔ لیکن اس
کی دلفریب صورت کو وہ دل میں بٹھائے رکھنا چاہتا تھا۔ رادھا کا چہرہ
منگل کے نزدیک ہو کر بھی بہت دور تھا۔

منگل سوچتا تھا۔ ہم سب ایک خاص مقصد لے کر اس دنیا میں لے
کر آئے ہیں۔ رادھا کی زندگی کا بھی وہی ایک مقصد ہے۔ لیکن ایسا
معلوم ہوتا ہے۔ جیسے رادھا مر گئی تھی۔ پھر پیدا ہوئی۔ لیکن اب کے....
....اب کے خدا جانے منگل اسے چھو نہیں سکتا۔ جیسے وہ دریا کے
کنارے پر بیٹھکر.... اس پار کے ایک درخت پر بیٹھے ہوئے پرندہ کو
پانے کے لئے غور کر رہا تھا۔ رات کے ٹمٹماتے ہوئے تارے جیسے خواب
خرگوش میں مزے لیتے ہوئے ہمارے دلوں کے حالات کو جاننے کی ناکام
سعی کرتے ہیں۔ منگل کا بھی وہی حال تھا۔

اس طرح منگل اور رادھا الگ راستے پر چلتے ہوئے۔ نزدیک ہو کر بھی
دور ہوتے ہوئے عرصہ تک ایک ساتھ رہے۔

ایک دن برسات کے موسم میں رات کیوقت اچانک بادل پھٹ جانے

سے چاند نمودار ہوا۔ چاند کی تھرکتی ہوئی کرنیں سوئی ہوئی دنیا کے چہروں
پر ناچ رہی تھیں۔ اس رات منگل سو نہ سکا۔ دل میں طوفان کا جذبات
لیے۔۔۔ فطرت کے رازہائے پنہاں کو سمجھنے کی ناکام سعی کر رہا تھا۔
اس نے اپنی کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی۔ چاند کی سیمیں کرنوں نے روانئے گنگا کو
زیادہ دلفریب بنا دیا تھا۔ نزدیک کے ایک باغ سے بیلا اور چنبیلی کی بھینی بھینی
خوشبو آ رہی تھی۔ چاروں طرف جھینگروں کی چرچر کی آواز سنائی دے ر
تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ ایسے وقت میں انسان اپنے خیالات ک
کر کے کچھ سوچ سکتا ہے یا نہیں۔ جواب میں صرف اتنا کہا جا
کہ اس کے دل کا کسی طرف جھکاؤ ہو جاتا ہے۔ پھولوں کے مان
کوئی معطر خوشبو کی لہر نکلتی ہے۔ اور جھینگروں کی مسلسل آ ... راس
کا دل دھک دھک کرتا ہے۔ معلوم نہیں منگل ا ... واز کی مانند
رہا تھا سوچتے سوچتے اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ ... وقت کیا سو
کر رہ گئی ہیں۔ آج برسات کی رات نے اپنے ... کی سی پابندیاں تو
اتار ڈالی ہے۔ آج رات اسے رادھا ... سے بادلوں کی نقاب
[illegible] ... ندی کے کنارے لوٹ
ہوئے مستدروالی رادھا کیطرح حسین۔ دلفریب اور سنجیدہ دکھائی دی
اس کے دل و دماغ کی تمام تر طاقتیں ... کھچا ہو کر رادھا کی طرف جھک گئیں
منگل اٹھ کر رادھا کی خواب گاہ میں ... لیا۔ رادھا اس وقت گہری نیند سو
رہی

منگل نے سر جھکا کر دیکھا۔ چاند کی کرنیں رادھا کے چہرے پر پڑ رہی ہیں۔ لیکن اُف یہ کیا وہ دلفریب چہرہ کیا ہُوا۔ یہ کیا۔ چتا کی آگ کے شعلوں نے اِس کے چہرے کے کچھ حصے کو جلا دیا تھا۔ اور کچھ خراب کر دیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے۔ منگل یہ دیکھ کر چونک سا پڑا۔ اور شاید اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔ چیخ کی آواز سن کر رادھا چونک کر جاگ پڑی۔ اس نے دیکھا منگل اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اسی وقت پلنگ چھوڑ گھونگھٹ کاڑھ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ منگل سمجھ گیا کوئی ناخوشگوار واقع ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ رادھا کے پاؤں پر گر کر اس نے کہا۔ رادھا مجھے معاف کرو۔

رادھا نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر کر اکبار منگل کی طرف دیکھا۔ اور دوسرے لمحہ وہ مکان سے باہر تھی پھر کبھی وہ منگل کے ہاں لوٹ کر نہ آئی۔ اور نہ کہیں اس کا پتہ ملا۔

جدائی کی نہ بجھنے والی آگ نے منگل کے دل پر ایک نہ مٹنے والا داغ لگا دیا۔

وصیّت نامه

جن لوگوں کا کہنا ہے۔ کہ بشوا ناتھ کی وفات کے وقت ان کی دوسری بیوی اپنے کمرے میں بیٹھی تاش کھیل رہی تھی۔ وہ لوگ گویا ساری دنیا کی برائی کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ رائی کا پہاڑ بنا کر ظاہر کرنا گویا ان لوگوں کا شیوہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اس وقت وہ گھی میں تلے ہوئے مصالحہ دار چنے ضرور چبا رہی تھی۔ لات پر لات دھرے اپنے شغل میں مشغول تھی۔ کہ بشوا ناتھ کو بلاوا آ گیا۔ ناک بھوں سکیڑ کر اس نے تھالی کو جو اب خالی ہو چکی تھی۔ پرے سرکا دیا۔ اور ماتھے پر شکن لاتے ہوئے کہا۔ ایک لمحہ بھی یہاں چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ آگ لگے ایسے گھر کو۔

مریض کی حالت غیر تھی۔ سانس اکھڑ اکھڑ کر آ رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن سب بے سُود۔ آخر انہوں نے جواب دے دیا۔ تو بشوا ناتھ کے بھائی بھولا ناتھ نے کہا۔ بھیا زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میرا خیال ہے۔ تم وصیت نامہ لکھوا دو۔

بشوا ناتھ آہستگی سے بولا۔ اچھا میں بولتا ہوں تم لکھو۔

بھولا ناتھ کاغذ قلم دوات جو پہلے ہی سے تیار تھے لے کر آ گئے۔

بشوا ناتھ نے لکھوایا۔ میں اپنی ساری جائیداد مع روپیہ زمین وغیرہ اپنی بیوی یشودھا کے نام لکھتا ہوں۔ اپنی زندگی میں ان چیزوں کی وہ مالک تھی

بھولا ناتھ کے ہاتھوں سے وہی لکھا۔ جو بشوا ناتھ نے لکھوایا۔ لیکن اس کا دل اسے قبول نہ کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بشوا ناتھ اپنی ساری جائیداد اپنے بھتیجے رام چرن کو دیں گے۔ کیونکہ بشوا ناتھ کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ اور اسی امید پر رام چرن کی ماں نے اسے ملازمت نہ کرنے دی۔ اس کی شادی بھی بہت جلدی کر دی گئی۔ اور رام چرن اب ایک بچے کا باپ بھی ہو چکا تھا۔ "تاہم بھولا ناتھ نے لکھا وہی جو بشوا ناتھ نے لکھوایا۔

تحریر ختم کرنے پر بھولا ناتھ نے دستخط کرنے کے لئے قلم بشوا ناتھ کے ہاتھ میں دیا۔ اس کے ہاتھوں میں سکت نہ تھی۔ پھر بھی ہمت کر کے آڑی سیدھی دو لکیریں کھینچ کر اس نے دستخط کر دیئے۔ بھولا ناتھ کے سوا کوئی بھی یقین نہ کر سکتا تھا۔ کہ یہ دستخط بشوا ناتھ کے ہیں۔ چپکے چپکے جب بشو ودھا آئی۔ اس وقت مریض اگلی دنیا کو جا چکا تھا۔ یہ دیکھ کر بشو ودھا رونے لگی۔

مدت مدید سے جو لوگ بشوا ناتھ کی دولت پر آنکھ لگائے بیٹھے تھے۔ لیکن وقت آنے پر جب انہیں کچھ نہ ملا۔ تو کہنے لگے ہمیں معلوم ہے۔ یہ رونا دھونا سب دکھاوے کا ہے۔" لیکن ان کے اس کہنے پہ یقین نہیں آتا۔

وصیت نامہ کا حال سن کر رام چرن کی ماں دوڑی آئی۔ اور آتے ہی

چلا کر کہنے لگی ۔ مرنے کے وقت تو آدمی کی عقل ماری جاتی ہے ۔ ایسے بھتیجے کے ہوتے ہوتے ہوئے ....

بھولا ناتھ کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی ۔ اور یہ محبت بعض اوقات ڈر کی صورت بھی اختیار کر لیتی تھی ۔ تو بھی ان سے نہ رہا گیا ۔ وہ دوڑ کر اس طرف آئے اور بولے ۔ رامو کی ماں ...... تم سٹھیا گئی ہو کیا ۔ اگر نہیں تو یہ کیا پاگل پن کر رہی ہو ۔ دادا چلے گئے ۔ لیکن میں تو زندہ ہوں ۔ تمہیں جو کہنا ہو اکیلے میں مجھ سے کہنا ۔ یہ وقت اِن باتوں کے لئے نہیں ۔

رام چرن اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا طبلے کی مشق کر رہا تھا ۔ چچا کی بیماری بڑھنے کی خبر اسے دو تین گھنٹے پہلے مل چکی تھی ۔ لیکن ایک گت کو اس نے چچا کی بیماری پر ترجیح دی ۔ اس لئے جب وقت وہ آیا بشوا ناتھ سرگباش ہو چکے تھے ۔

دروازے پر آتے ہی رام چرن کو یہ بات معلوم ہو گئی ۔ کہ وصیت نامہ لکھا جا چکا ہے ۔ اور اس میں اس کے نام ایک پیسہ بھی نہیں لکھا گیا ۔ آتے ہی مردے کو ڈانٹ کر بولا ۔ پیچھیں منہ کون پھونکتا ہے ۔ شرادھ کون کرتا ہے ۔ میں تو کچھ بھی نہ کروں گا ۔ —— لیکن مرحوم کو ان میں میں سے کسی پر بھی اعتقاد نہ تھا ۔ وہ بہت سا عرصہ کلکتہ میں رہے تھے ۔ اس لئے آزاد خیال تھے ۔ مذہبی خیال سے جن اشیاء کا استعمال

ممنوع ہے۔ وہ انہیں کھلے بندوں کھاتے تھے۔ لیکن اگر کوئی انہیں عیسائی کہتا۔ تو کہتے۔ ہرے ہرے ہرے میں اور عیسائی۔ اگر عیسائی ہوں تو گوشت کیوں کھاؤں۔

زندگی میں جن کا یہ حال تھا۔ مرنے کے بعد منہ میں آگ نہ ڈالنے یا یا انہیں شرادھ نہ کرنے کی دھمکی دینا محض بے معنی تھا۔ لیکن اس وقت رام چرن کو مرحوم چچا سے بدلہ لینے کا اور کوئی طریقہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ یہ سوچ کر اسے تسلی ہوئی۔ کہ سورگ میں چچا بھوکے رہیں گے۔ اس نے سوچا۔ میں تو چچا کی جائیداد نہ ملنے کے باوجود بھی اپنا پیٹ بھر لونگا۔ لیکن چچا جس پر لوک گئے ہیں۔ وہاں بھیک بھی نہیں ملتی۔

بھولا ناتھ نے اپنی بھاوج کے پاس جا کر کہا۔ بھابی۔ دادا اپنی ساری جائیداد تمہارے نام لکھ گئے ہیں۔ یہ لو وصیت نامہ! اسے حفاظت سے رکھنا۔

اس وقت بشوا ناتھ کی بیوہ اونچے اونچے سروں میں الاپ کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ گاؤں کی دو چار اور عورتیں سر میں سر ملا کر گاؤں والوں کی نیند میں مخل ہو رہی تھیں۔ کہ اس کاغذ کے ٹکڑے نے بیچ میں آکر اس سلسلے کو بند کر دیا۔

ارے رام ہرے رام میں تو لٹ گئی۔ میرا تو سرو ناش ہو گیا۔ اچھا بھولا ناتھ یہ وصیت نامہ کس کا لکھا ہے۔ تمہارا لکھا ہے۔ ہائے مرے

اب مجھے اس طرح کون پیار کرے گا۔ ہائے میں ان سے پہلے کیوں نہ مرگئی۔ اب میری اس دنیا میں ضرورت ہی کیا ہے۔

ایک لمبی سانس لے کر بھولا ناتھ نے کہا۔ ہم لوگوں کی بدنصیبی ہے گھر جانے پر رام چرن کی ماں بھولا ناتھ کے پیچھے پڑ گئی۔ جس طرح لدی ہوئی گاڑی سمیت گڑھے میں گرا ہوا بیل مالک کے ہزاروں ڈنڈے کھانے پر بھی چپ چاپ کھڑا رہتا ہے۔ اسی طرح بھولا ناتھ بھی چپ چاپ سب کچھ سنتے اور سہتے رہے۔ بالآخر دبی زبان سے بولے۔ میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو انہیں مارا۔ جو مجھ پر بگڑ بیٹھی ہو۔

رام چرن کی ماں ناگن کیطرح پھنکارتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اور بولی۔ تمہارا کیا قصور ہے۔ تم بڑے بھلے مانس ہو۔ تم کو کچھ بھی معلوم نہیں۔ دادا نے کہا لکھو۔ اور تم نے لکھ ڈالا۔ تم سب ایک سے ہو نہ اس لئے۔ تم بھی مرتے وقت ایسا ہی کر جاؤ گے۔ میرے مرتے ہی کسی ڈائن کو بیاہ لاؤ گے۔ اور اسی کے نام سب کچھ لکھ دو گے۔ میرے رام چرن کو تو کنگال کر دو گے۔ مگر بے فکر رہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں جلدی نہیں مرنے کی۔

اسی طرح بھولا ناتھ کو سخت سست کہتے کہتے اُن کی بیوی کا غصہ زیادہ ہونے لگا۔ بھولا ناتھ اچھی طرح جانتے تھے۔ کہ اپنی بیوی کے غصّہ بیٹے کے تیور اور روز کی بک بک کو دور کرنے کے لئے اگر وہ ذرا بھی

کوشش کریں گے۔ تو بھلائی کے بدلے برائی ہوگی۔ اسی خوف سے ایک ملزم کی مانند بچارے چپ چاپ رہے۔ جیسے وہ سب کچھ کر چکے ہیں۔ جیسے وہ رام چرن کو کچھ نہ دے کر دوسری عورت کے نام وصیت نامہ لکھ چکے ہیں۔ اب جرم کا اقبال کرنے کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں۔

اس دوران میں رام چرن نے اپنے عقلمند دوستوں سے صلاح مشورہ کر کے اپنی ماں کو آکر کہا۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ یہ جائیداد مجھے ہی ملے گی۔ کچھ دنوں کیلئے بابو جی کو یہاں سے بھیج دینا چاہیئے۔ ان کی موجودگی میں معاملہ بننے کی بجائے بگڑ جائے گا۔

رام چرن کی ماں کو اپنے خاوند کے بیوقوف ہونے میں رتی بھر بھی شک نہ تھا۔ لڑکے کی رائے اسے بھی پسند آگئی۔ اور بالآخر اس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے۔ کہ مجبوراً کچھ عرصہ کیلئے بھولا ناتھ کو گھر چھوڑنا پڑا۔ انہوں نے کاشی جا کر ایک دوکان پر نوکری کر لی۔

بھولا ناتھ کے جاتے ہی۔ رام چرن اور بیشو ماں نے ایک دوسرے پر جعلی وصیت نامہ بنانے کا مقدمہ دائر کر دیا۔ رام چرن نے عدالت میں ایک وصیت نامہ پیش کیا جس کی رو سے سب جائیداد کا وہ مالک تھا۔ جس پر مرحوم بیشو ناتھ کے صاف دستخط تھے۔ اس کے علاوہ رام چرن نے وصیت نامہ کی تحریر کے وقت کے تین چار گواہ اپنے بیان کے درست ثابت کرنے کے لئے پیش کر دیئے۔

یشودھا کے گواہ صرف بھولا ناتھ ہیں۔ اور اس کے وصیت نامہ پر دستخط بھی صاف نہیں ہیں۔ یشودھا کے گھر میں اس کا ایک ممیرا بھائی رہتا تھا۔ اس نے کہا تم فکر نہ کرو۔ میں گواہ بھگتاؤں گا۔ معاملہ جب اچھی طرح چل چکا۔ تو رام چرن کی ماں نے بھولا ناتھ کو کاشی میں اپنی سخت بیماری کا تار بھجوایا۔ تار پاتے ہی بھولا ناتھ بیوی سے آخری ملاقات کے خیال سے گھر آئے۔ معلوم نہیں گھر آ کر بیوی کو سخت بیمار ہونے کی بجائے پلنگ پر بیٹھ کر کچوریاں کھاتے دیکھکر حیرانی ہوئی یا ڈر۔

جس وقت بھولا ناتھ گھر آئے۔ اسی وقت اچانک عدالت کے چپڑاسی نے آکر آواز دی۔ بھولا ناتھ نے سرکاری تحریر پڑھی تو معلوم ہُوا کہ عدالت سے گواہی کیلئے ان کے نام پروانہ آیا ہے۔ گواہی کے کاغذات دیکھکر وُہ سناٹے میں آ گئے۔ کاغذات کو بغور پڑھ کر جب وہ معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تو رام چرن کی ماں نے آکر رونا شروع کر دیا۔ بولی۔ وہ ڈائن میرے بچے کے چچا کی جائیداد ہڑپ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ رانڈ میرے لاڈلے کو جیل بھجوانے کی تیاری میں ہے۔ آہستہ آہستہ معاملہ بھولا ناتھ پر کھلا تو چلا کر کہا۔ یہ تم نے کیا غضب کیا آہستہ آہستہ اپنا اصلی روپ دھارن کر کے گھر والی نے کہا۔ کیوں اجی رام چرن نے کیا قصور کیا۔ وہ اپنے چچا کی جائیداد چھوڑ دے۔ بھلا دنیا کا کون بھتیجا برداشت کر سکتا ہے۔ کہ کالے کوسوں کی کوئی عورت آکر اس کے

چچا کی جائیداد پر قبضہ کر لے۔ اور وہ منہ تکتا رہ جائے۔ اگر مرتے وقت چچا کی عقل ماری گئی تھی۔ اور جائیداد وہ اپنی بیوی کے نام لکھ گیا ہے۔ تو کیا بھتیجا اس کی اس غلطی کو درست نہیں کر سکتا۔ کیا یہ ناانصافی ہے۔

بھولا ناتھ گھبرا سے گئے۔ بیوی اور بیٹے کو جب انہوں نے ایک ہی مرض کا مریض پایا۔ اور دیکھا۔ کہ انہوں نے یشودھا کے خلاف جہاد کرنے کا مکمل انتظام کر لیا ہے۔ تو ماتھا ٹھونک کر رہ گئے۔ نہ کچھ کھایا۔ نہ کچھ پیا۔

شاعر کی شکست

راج کماری کا نام تھا۔ اپراجیتا۔ مہاراجہ اودے نارائن سنگھ کے درباری شاعر شیکھر نے کبھی اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا۔ لیکن جس دن کوئی نئی چیز لکھکر دربار میں بیٹھکر راجہ کو سناتے۔ اس دن اپنی آواز کو اتنا بلند کر لیتے تھے۔ تاکہ شاہی محل کی سب سے اونچی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑی لیکن نظر نہ آنیوالی راجکماری بھی سن لے۔ یا یوں سمجھ لیجئے۔ جس طرح اس ہنگامے بھری دنیا میں کوئی تارک الدنیا گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنی آواز کو بارگاہِ ایزدی تک پہنچانے کی سعی کرتا ہو۔

شاعر کو کبھی سایہ سا نظر آتا تھا۔ اور کبھی کبھی چھاگل کی جھنکار کی آواز اس کے کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے سوچتے۔ کہ وہ دو پاؤں کیسے ہیں جن میں سونے کی قیمتی جھانجر پڑے ہوئے چھن چھن کی مترنم آواز میں ایک عجیب و غریب نغمہ پیدا کرتے ہیں۔ دونوں پاؤں کے سرخ سرخ تلوے جو آفتاب عالمتاب کی شعاع اولیں کی مانند چمکدار اور شیریں ہیں۔ کتنے خوبصورت ہوں گے۔

ہمیشہ شاعر کا دل ان پاؤں کے لئے سوچا کرتا۔ کبھی کبھی شاعر انہیں خیالات میں غرق ہو کر اپنی لکھی ہوئی نظموں کو دربار میں جھانجروں کے اس دلفریب نغمہ کی سروں پر گا گا کر سناتا۔

راجکماری کی خادمہ منجری جب دریا کے کنارے گھاٹ پر نہانے یا پانی بھرنے کیلئے جاتی تو اسے شیکھر کے مکان کے پاس سے ہو کر

گزرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ گھاٹ کی راہ اس کے مکان کے پاس سے گزرتی تھی
گھاٹ پر آتے جاتے منجری کا دل شاعر سے ایک دو باتیں کئے۔ بغیر
نہ رہ سکتا۔ اور کبھی اندھیرا ہوتا۔ تو وہ خادمہ شاعر کے گھر کے اندر جا
کر بھی تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاتی۔ دن میں وہ جتنی دفعہ گھاٹ پر
جاتی۔ درحقیقت اتنی بار جانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر بفرضِ
محال ضرورت بھی ہوتی۔ تو گھاٹ پر جاتے وقت رنگین دھوتی اور آم
کا منجرا کانوں میں پہنکر جانے کا کوئی سبب نظر نہ آتا تھا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر لوگ ہنستے اور کانا پھوسیاں بھی کرتے۔ اس میں ان
لوگوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ منجری کو دیکھکر شیکھر کے دل کو ایک گونہ مسرّت
کا احساس ہوتا تھا اور اپنی اس خوشی کو چھپانے کے لئے کبھی اس نے کوئی
کوشش نہ کی تھی۔

اس خادمہ کا نام منجری تھا۔ اور عام لوگوں کی رائے میں یہی نام اس کے
لئے مناسب بھی تھا۔ لیکن کوی شیکھر خدبات کی رو میں آکر اسے بسنت
منجری کہہ کر پکارتے تھے۔ لوگ سن کر کہتے تعجّب کی بات ہے۔ ایک
خادمہ کی اتنی عزّت۔

اب شیکھر کی نظموں میں منجل منجری وغیرہ الفاظ کا استعمال عام
دیکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شاعر اور خادمہ کی راہ رسم کی خبر راجہ کے کانوں
تک بھی پہنچ گئی۔ اپنے درباری شاعر کی طبیعت کو اسقدر رنگین دیکھکر راجہ

بہت ہنسے۔ وہ کبھی کبھی اس موضوع پر کوی سے دل لگی بھی کرتے تھے۔
کوی بھی راجہ کی اس دل لگی پر ہنس دیتے۔

راجہ ہنس کر پوچھتے۔ پھر کیا محفل بہار میں ہی نغمہ سرا ہوتا ہے۔
کوی جواب دیتے۔ جی نہیں وہ منجری کے پھولوں کا رس بھی لیتا ہے۔
اسی طرح سب ہنستے۔ اور آپس میں ہنسی مذاق کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ راجکماری بھی منجری سے اس موضوع پر ہنسی مذاق کیا کرتی تھی جنہیں سن کر منجری کبھی ناراض نہ ہوتی تھی۔
اسی طرح سچ اور جھوٹ کی ملی جلی کھچڑی پکاتے انسانی زندگی کٹ جاتی ہے۔

زندگی کے اس کھیت میں کچھ جذبات بوئے جاتے ہیں۔ کچھ انسان خود بوتا ہے۔ اور کچھ چار آدمی مل کر بوتے ہیں۔ انسانی زندگی بھی ایک طرح کی گدڑی ہے۔ اس میں سچ اور جھوٹ۔ محبت اور نفرت کے پیوند لگے ہوتے ہیں۔

کوی جو کلام پڑھتے۔ وہ سچائی اور سچے پریم کا پیام تھا۔ ان کی شاعری کا موضوع —— وہی رادھا اور کرشن —— وہی عورت اور مرد وہی دکھ اور سکھ کا بیان ہوتا تھا۔ شیکھر کی شاعری ہی اس کے دل کے اندرونی حالات کی آئینہ دار ہوتی۔ اس شاعری کو راجہ سے لے کر رعایا تک ہر ایک غریب اور معمولی آدمی نے اپنے دل میں جانچ لیا تھا۔ ان کی شاعری

سب کے سکھ میں سنی جاتی تھی۔ ملک کے دیگر لوگ بھی ان کی.... شاعری کے دل وجان سے دلدادہ تھے۔

اسی طرح بہت سے دن گذر گئے۔ شیکھر کو تا لکتے تھے۔ راجہ سنتے تھے اور شاہی دربار کے سب مصاحب وحاضرین واہ واہ کرتے تھے۔ منجری گھاٹ پر آتی تھی۔ محل کی سب سے اونچی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی میں کبھی کبھی سایہ نظر آتا تھا۔ اور کبھی کبھی جھانجروں کی جھنکار کی آواز کانوں میں پڑتی تھی۔

(۲)

انہیں دنوں شمالی ممالک کے عالم پنڈت پنڈریک مختلف ممالک کے عالموں اور شاعروں پر فتح پاتے ایک دن مہاراجہ ادے نارائن کے دربار میں آ نکلے۔ نہایت صاف الفاظ میں راجہ اور اس کے راج کی صفت کرکے وہ دربار میں ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ تمام دنیا کے عالموں پر فتح پانے کے خیال سے اس ملک کے عالم سے مقابلہ کرنے کیلئے یہاں آئے تھے۔

راجہ نے بڑی عزت کے ساتھ کہا آئیے۔

پنڈریک کوی نے ایک خاص انداز سے جواب دیا۔ مقابلہ۔ مقابلہ۔ راجہ کی عزت کو برقرار رکھنا ہی ہوگا۔ مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن شاعری کا مقابلہ کسطرح کا ہوتا ہے۔ یہ شیکھر کو بالکل معلوم نہ تھا۔ اس خیال سے وہ از حد متفکر اور پریشان ہوا تھے۔ رات کو اسی خیال سے اچھی طرح نیند بھی نہ آئی۔ مقابلہ کے خیال سے کوی پنڈریک کا لمبا اور چوڑا جسم۔ اسکی موٹی موٹی

آنکھیں۔ اس کی کشادہ پیشانی۔ ساری رات انہیں اپنے ارد گرد گھومتے دکھائی دیتے۔

صبح دھڑکتے ہوئے دل کیساتھ کوی شیکھر دربار میں پہنچے۔ صبح سے ہی احاطہ دربار میں ہزاروں آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اتنی بھیڑ اور شور و شغب تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی نہ دیتی تھی۔ شہر کے سب کا۔ دربار آج بند تھے۔

بڑی مشکل سے اپنے منہ میں ہنسی اور چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کوی شیکھر نے اپنے مدِ مقابل پنڈریک کوی کو نمسکار کیا پنڈریک نے تکبر کے جوش میں اشارے سے اس نمسکار کو پھیر دیا۔ اس کیساتھ ہی وہ اپنے ساتھ آئے ہوئے احباب کیطرف دیکھکر ہنسے۔

شیکھر نے ایکبار محل کی اسی اونچی کھڑکی کی جانب نظر یں اٹھا کر دیکھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا۔ جیسے آج اس کھڑکی سے مسلسل سایہ نظر آرہا ہے دربار کے شور و شر سے دل کو بھرا کر ایکبار اپنی جے لکشمی کی یاد کر لی۔ انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ اگر آج میری فتح ہو گئی۔ تو اے دیوی۔ اپراجیتے ——

تمہارا نام اس دنیا میں غیر فانی ہو گا۔

اچانک دربار کے بینڈ اور باجے بج اٹھے۔ سفید لباس میں ملبوس مہاراج اودے نارائن برسات کی پہلی گھٹا کی مانند دربار میں تشریف فرما ہوئے۔ اور نہایت آہستگی سے اپنے سنگھاسن پر رونق افروز ہو گئے۔

پنڈریک اٹھے اور سنگھاسن کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ دربار جہاں

ایک لمحہ پہلے شور و شغب تھا۔ پھر بالکل سناٹا چھا گیا۔
بھیاتی کو چوڑا کر کے گردن کو ہلا ہلا کر لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے کوی پنڈریک
سنجیدگی کے انداز میں راجہ کی صفت کرنے لگے۔
ان کی سنجیدہ آواز دربار میں گونج رہی تھی۔ ان کی آواز لمبے چوڑے محلّات
کی دیواروں میں۔ کھمبوں میں۔ چھت میں۔ سمندر تند لہروں کی مانند سنجیدگی
کے ساتھ ٹکرانے لگی۔ حاضرین کے دل اس غضبناک آواز کو سن کر تھرا تھرا
اٹھے۔ پنڈریک نے اودے نارائن نام میں، نئے جذبات اور تخیلات سے کیا
کیا خوبیاں پیش کیں۔ اس نام کے حروف کو کئی صورتوں میں کئی صفات کے
ساتھ حاضرین کے سامنے پیش کیا۔
پنڈریک جب اپنا کام ختم کر چکے۔ تو کچھ دیر تک مضبوط پتھروں کے
محلات کی دیواریں۔ ہزاروں انسانوں کے دل جیسے گونجتے سے رہے۔ دور
دور سے آئے ہوئے ودوان اور پنڈت داہنا ہاتھ اٹھا اٹھا کر اونچی آوازیں
خوب خوب پکار اٹھے۔
تب سنگھاسن سے راجہ نے کوی شیکھر کی طرف دیکھا۔ شیکھر نے
بھی عقیدتمندانہ اور بے غرور نگاہوں سے راجہ کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد
وہ آہستگی سے اٹھکر کھڑے ہو گئے۔
رام نے دنیا کے منہ بند کرنے کیلئے جب دوسری مرتبہ سیتا کی پریکشا،
لینی چاہی تھی۔ تب سیتا بالکل اس جذبہ سے دیکھکر اپنے سوامی کے سنگھاسن

کے روبرو کھڑی ہوئی تھی۔ کوی کی خاموش
نگاہوں نے چُپ چاپ راجہ کو جتایا۔ میں آپ ہی کا ہوں۔ آپ اگر
حاضرین کے سامنے کھڑا کرکے میرا امتحان کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیجئے لیکن ـــ
اس کے بعد کوی نے اپنی نگاہیں جُھکا لیں۔
بینڈریک شیر کی مانند تن کر کھڑے ہوئے تھے۔ شیکھر چاروں طرف
سے گھرے ہوئے ہرن کیطرح کھڑے ہوئے۔ وہ نوجوان تھے۔ ان کا
چہرہ ایک نوجوان عورت کی طرح۔ شرم اور محبت سے جذبات کیطرح
نازک تھا۔ جسم بہت ہی سادہ تھا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ جذبات
کے آتے ہی وہ زندگی کے ساز کی مانند کانپ کر بج اُٹھے گا۔
شیکھر نے سر اٹھائے بغیر ہی نہائیت مدّھم آواز میں اپنا کلام پڑھنا
شروع کیا۔ پہلے کا ایک آدھ شلوک انہوں نے اتنی آہستگی سے ادا کیا
کہ لوگ اچھی طرح سے سن بھی نہ سکے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ انہوں
نے سر اٹھایا۔ جہاں نگاہ ڈالی۔ وہاں ہی جیسے خواہ وہاں آدمی تھے۔ یا
دیواریں۔ ان کے رس بھرے کلام میں غرق ہو گئے۔ شیریں اور مہین آواز
کانپتے کانپتے آگ کے شعلوں کیطرح اُوپر اٹھنے لگی۔ شیکھر نے پہلے
چندر بنسی راجاؤں کے حالات کہنے شروع کئے۔ نہائیت خوبصورت
الفاظ میں کتنے ہی واقعات۔ راجاؤں کی بہادری کے قصے۔ ان کی لڑائیاں
ان کی خدا پرستی۔ دان۔ پن۔ سادھو سیوا اور دیگر ایسی ہی چیزوں کا بیان

کرتے کرتے کوی شیکھر اپنی کویتا کو عہد حال تک لے آئے۔ دیگر ممالک کے راجاؤں کا ذکر کرنے کے بعد کوی نے راجہ اودے نارائن کی رعایا پروری اور پرجا کا راجہ سے پریم۔ کو نہایت موزون الفاظ میں۔ خوبصورت و مرصّع اشعار میں جیسے اسے بالکل دربار کے بیچ میں لاکر کھڑا کردیا۔ اور گیا۔ شاعر کے اچھوتے خیالات نے اس برسوں کے پرانے محل کو جیسے ایک بہت ہی اونچا درجہ بخش دیا۔ اس محل کی ایک ایک اینٹ کو جیسے ان جذبات نے ایک من موہنی صورت بخش دی۔ چوما۔ اور پھر اوپر اس کھڑکی کی طرف راج لکشمی راجکماری اپراجتا کے پاؤں میں وہ رنگین تخیل عقیدت کیساتھ لوٹنے لگا۔ اس کے بعد جیسے وہ عقیدت بھرا دل وہاں سے لوٹ کر راجہ کے سنگھاسن کے اردگرد سینکڑوں بار گھومنے لگا۔ بالآخر شیکھر نے کہا۔ مہاراج کویتا میں چاہے کوئی مجھے شکست دیدے۔ لیکن بھگتی میں کوئی مجھ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس کے بعد کانپتے ہوئے کوی شیکھر بیٹھ گئے۔ تب آنسوؤں میں تربتر حاضرین نے جے جے کار کے فلک شگاف نعروں سے جیسے آسمان ہلادیا۔

شیکھر کے جذبات کا ایک طرح سے مذاق اڑاتے ہوئے پنڈت پنڈریک کھڑے ہوگئے۔ اور گرجتی ہوئی آواز میں بولے۔ شاعری اور اس کے جذبات سے بڑھکر دنیا میں کیا ہے۔ دربار میں اس دم سناٹا چھاگیا۔

اب پنڈریک مختلف اشعار سے اپنی علمیت کا اظہار کرنے لگا۔ روز

آفرینش سے سب وید اور پران یہی کہتے آرہے ہیں۔ کہ دنیا میں گوتاہی سب سے بڑھکر ہے۔ یہ بیان ہی محض سچا ہے۔ یہی برہما ہے۔ برہما۔ وشنو۔ مہیش سب اسی کے قبضے میں ہیں۔ بالکل میں تو یہی کہوں گا۔ کہ جذبات ان سب سے بڑھکر ہیں۔ برہما اپنی چار زبانوں سے بھی اس کا بیان نہیں کر سکے۔ شیو جی اپنے پانچ منہ سے بھی اس کی حقیقت کو نہ پاکر خاموش ہوگئے اور بالآخر اسی کی تہ تک پہنچنے کیلئے سمادھی لگاکر بیٹھ گئے۔ اسی طرح علمیت پر علمیت اور شاستروں ویدوں کا ذکر کرکے گویا پنڈریک نے آسمان کو چھونے والا ایک سنگھاسن سا بنا دیا۔ اور اس پر اس دنیا اور دیوتاؤں کی پیشانی پر جذبات کے بیان کو بٹھا دیا۔ اسی طرح پھر گرج کر پوچھا۔ بیان سے بڑھ کر دنیا میں کیا ہے۔

پنڈریک ایک فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگے۔ جب کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ تب آہستہ سے بیٹھ گئے۔ پنڈت لوگ۔ سادھو۔ سادھو خوب خوب کہنے لگے۔ راجہ چکرا گئے۔ اور کوی شیکھر نے اس بہت بڑے عالم پنڈریک کے سامنے اپنی ہستی کو خاک کے ذرّے کی مانند سمجھا۔

اس کے بعد دربار برخاست ہوگیا۔

(۳)

دوسرے دن شیکھر نے دربار میں آکر گانا شروع کر دیا۔

برندابن میں پہلے بنسی بجی۔ تب گوپیوں کو معلوم نہ تھا۔ کہ کس نے بنسی بجائی۔

وہ نہیں جانتی تھیں ۔ کہ کہاں بنسی بج رہی ہے ۔ ایکبار جان پڑا ۔ کہ پنگھٹ کی طرف سے بنسی کی یہ آواز سنائی دے رہی ہے ۔ پھر ایسا معلوم ہوا ۔ کہ جیسے کوئی بہت اونچے ٹیلے پر کھڑا ہو کر ملنے کے لئے بلا رہا ہے ۔ پھر معلوم ہوا کہ جیسے گوشۂ عافیت میں کوئی بیٹھا درد جدائی سے بیقرار ہو کر رو رہا ہے ۔ پھر جان پڑا ۔ جیسے جمنا کی ہر ایک لہر سے بنسی کی صدا آ رہی ہے ۔ پھر ایسا معلوم ہوا ۔ کہ آسمان کا ہر ایک تارہ جیسے اس بانسری کا چھید ہے ۔ اور بالآخر ایسا احساس ہوا ۔ کہ ہر ایک وادی میں ۔ ہر ایک راہ میں ۔ ہر ایک پھول اور پھل میں ۔ خشکی اور تری میں ۔ اونچ اور نیچ میں ۔ اندر اور باہر ۔ سب جگہ بانسری بج رہی ہے ۔ بانسری کیا کہتی ہے ۔ یہ کوئی گوپی نہ سمجھ سکی ۔ اور بانسری کے آواز کے جواب میں دل کیا کہنا چاہتا ہے ۔ اس کا کوئی بھی فیصلہ نہ کر سکی ۔ لیکن ہر ایک کی آنکھ میں آنسو بھر آئے ۔ بھگوان کرشن کی بانسری کی شیریں آواز کا خیال کر کے سب کے دل محبت اور عقیدت سے بھرپور ہو گئے ۔

دربار کو بھول کر ۔ راجہ کو بھول کر ۔ اپنے اور پرائے کو بھول کر ۔ توقیر و توہین سوال و جواب غرضیکہ ہر ایک چیز کو بھول کر شیکھر اپنے دل کے گوشہ میں بالکل اکیلے کھڑے ہو کر بانسری کا یہ پُر تاثیر نغمہ گا گئے ۔ ان کے دل میں ایک پُر راز جلال تصویر رونق افروز تھی ۔ اور کانوں میں وہی جھانجھروں کی جھنکار گونج رہی تھی ۔ کوی جب اپنا کام ختم کر کے بیٹھ گئے ۔ تب ایک عقیدتمندانہ جوش سے حاضرین دربار کے دل بھر گئے ۔ کسی کے منہ سے داد کا کوئی لفظ نہ نکلا ۔

اس کے چند لمحہ ساعت بعد پنڈریک پھر سنگھاسن کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ کھڑے ہو کر انہوں نے پوچھا۔ رادھا کون ہے۔ اور کرشن کون ہے۔ پھر انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ اپنے چیلوں کی طرف دیکھکر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ رادھا کون ہے۔ اور کرشن کون ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھکر کہ کوئی اس بات کا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ خود ہی کہنے لگے۔

رادھا اونکار ہے۔ کرشن دھیان یوگ ہے۔ اور برندابن ان دونوں کے بیچ کا بندو ہے۔ پھر رادھا اور کرشن ان دو الفاظ کے تمام حروف کے جتنے معانی اور تفصیل کہی جا سکتی ہے۔ انہوں نے کہہ سنائی۔ کبھی سمجھایا۔ کہ کرشن یگیہ ہے۔ اور رادھا اگنی۔ کبھی سمجھایا۔ کرشن وید ہے۔ اور رادھا شد شن ہے یہ سب کچھ کہہ کر راجہ کیطرف۔ سب کیطرف۔ بالآخر شیکھر کیطرف دیکھکر پنڈریک بیٹھ گئے۔ پنڈریک کی بے پناہ علمیت اور قابلیت پر راجہ دل و جان سے فدا ہو گئے۔ دربار میں بیٹھے ہوئے دو دانوں کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ کرشن اور رادھا دونوں ناموں کی نئی نئی تفصیلات میں ہنسی کی تان جمنا کی لہریں۔ پریم اور محبت ایکدم دور ہو گیا۔ زمین کے اوپر سے جیسے کسی نے لبندت کا ہرا رنگ پونچھ کر شروع سے لیکر اخیر تک پوتر گوبر لیپ دیا۔ شیکھر اپنے اتنے دنوں کی لکھی ہوئی کوتا کو فضول سمجھنے لگے۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی ہمت ان میں نہ رہی۔ اس دن بھی دربار برخاست کر دیا گیا۔

(۴)

تیسرے روز پنڈریک نے سورج طلوع ہونے۔ سورج غروب ہونے رات ہونے۔ زبان کی مٹھاس۔ زندگی اور موت کے فلسفے۔ خوشامد۔ تعریف برائی اور ایسے ہی موضوعوں پر اپنی الفاظ کی قابلیت کے زور سے وہ لیکچر دیا۔ کہ سن کر سب لوگ سناٹے میں آ گئے۔

شیکھر جو شاعری کرتے تھے۔ وہ بہت ہی سادہ ہوتی تھی۔ اُسے دُکھ دُکھ۔ خوشی اور غمی کے مواقع پر عام لوگ استعمال میں لاتے تھے۔ آج سب لوگوں کو یقین ہو گیا۔ کہ اس شاعری میں کوئی خوبی یا خاصیت نہیں ہے۔ نہیں انہیں خیال آیا۔ کہ اگر چاہیں تو وہ خود بھی ایسی کویتا کر سکتے ہیں۔ محض وہ ناتجربہ کاری اور وقت نہ ملنے کے باعث نہیں لکھ سکتے۔ شیکھر کی شاعری میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس کے کلام میں دنیاوی لوگوں کو کوئی سبق نہیں ملتا پڑھکر دل کو خوشی بھی نہیں ہوتی۔ ——— لیکن آج جو کچھ پنڈریک کے منہ سے سنا۔ وہ عجیب و غریب ہے۔ کل جو پنڈریک نے کہا تھا۔ اس میں بھی سب باتیں عذر طلب اور سیکھنے کی نہیں۔ پنڈریک کی علمیت کے آگے انہوں نے اپنے کوی شیکھر کو محض ایک طفل مکتب خیال کیا۔

مچھلی کو دُم سے پکڑ کر جھٹکنے سے پانی میں جو گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی ہر ایک لہر ہر ایک گرداب کو جیسے کنول کا پھول کر سکتا ہے۔ ویسے ہی شیکھر نے بھی اپنے دل میں چاروں طرف دربار میں بیٹھے ہوئے حاضرین کے

دکی بات پڑھ لی۔ آج آخری دن ہے۔ آج ہار جیت کا فیصلہ ہو جائے گا۔
راجہ نے اپنے شاعر کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ کا مطلب یہی تھا۔
کہ آج خاموش بیٹھے سے کام نہ چلے گا۔ تمہیں ہر ممکن کوشش کرنی پڑے گی۔
شیکھر اٹھ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے صرف ایک دو باتیں کہیں
ہے دیوی اے زمانے کو پالنے والی۔ اگر تم اپنے پھولوں بھرے باغ
کو چھوڑ کر اس خطۂ زمین پر کھڑی ہوئی ہو۔ تو تمہارے جو بھگت آبِ حیات
کے پیاسے ہیں۔ ان کی کیا حالت ہو گی۔ یہ باتیں سر کو اونچا کر کے اور
بلند آواز سے شاعر نے کہیں۔ جیسے دیوی راجہ کے سنگھاسن کے سہانے
کی کھڑکی میں کھڑی ہے۔

تب پنڈریک اٹھ کر زور سے ہنسے۔ اور لفظ شیکھر کے آخری دو
حروف کو لے کر شلوک بنانے لگے۔ پنڈریک نے کہا۔ کہ پھولوں کے
بن کے ساتھ معمولی زمین کا کیا تعلق ہے۔ اور راگ میں اس کی چرچا عام ہونے
پر انسان نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے
شیکھر کی تقریر کی دھجیاں اڑا دیں۔

دو وان لوگ اس بات کو سن کر ہنسنے لگے۔ انہیں ہنستا دیکھ کر باقی سب
بھی ہنسنے لگے۔ خواہ انہوں نے پنڈریک کی بات کا مطلب سمجھا تھا یا نہیں
اپنے درباری شاعر کی اس طرح توہین ہوتی دیکھ کر راجہ بار بار اس کی طرف
[illegible] ...... دیکھتے۔ لیکن شیکھر اس کی طرف توجہ نہ دیتے

ہوئے سر نیچا کرکے بیٹھے رہے۔
تب راجہ دل ہی دل میں شیکھر پر بہت ناراض ہوکر سنگھاسن سے اتر آئے۔ انہوں نے اپنے گلے کی موتیوں کی مالا اتار کر پنڈریک کو پہنا دی جے جے کار کے نعرے بلند ہوا ٹھے۔ محل کی اونچی منزل کی کھڑکی کے پاس چھاجنجروں کی مسلسل سی آواز آئی۔ اسے سن کر شیکھر اپنی مسند سے لٹھے اور آہستہ آہستہ دربار سے نکل گئے۔
اماوس کی اندھیری رات تھی۔ اندھیرا پھولوں کی خوشبو لئے مغربی ہوا سے چھیڑ چھاڑ اور اٹھکیلیاں کرتا کھڑکیوں اور جھروکوں سے گاؤں کے ہر ایک گھر میں داخل ہو رہا تھا۔
گھر کی الماری سے اپنی سب کتابیں نکال کر شیکھر نے سامنے ڈھیر کر دیں۔ ان سے چھانٹ چھانٹ کر اپنے لکھے ہوئے گرنتھ الگ کیے۔ ان میں کئی گرنتھ اس سے بہت دن پہلے لکھے تھے۔ کئی ایک کو تو وہ بالکل بھول گئے تھے۔ انہیں الٹ پلٹ ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ آج انہیں اپنی زندگی کی یہ سب کمائی دو کوڑی کی جچنے لگی۔
ایک لمبی سانس لیکر انہوں نے کہا۔ زندگی بھر میں کیا میں نے یہی کچھ اکٹھا کیا ہے۔ کچھ مضامین ——— اشعار اور نظمیں ——— آج شیکھر کو اپنے کلام میں نہ زندگی کا فلسفہ۔ کوئی روشنی یا دل کو تسکین دینے والی کوئی بات نظر نہ آئی۔ بیمار کو جیسے روٹی نہیں بھاتی اسی طرح آج انہیں کچھ راس

نہ آتا تھا۔ جو سامنے ہاتھ میں پڑا۔ اسی کو ہٹا دیا۔ راجہ کی رفاقت ـــــــ عوام میں مقبولیت ـــــــ دل کی امید۔ سب آج اس اندھیری رات میں خوفناک سے معلوم ہونے لگے۔

تب انہوں نے ایک گرنتھ کو پھاڑ کر سامنے جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔ اچانک انہیں دل لگی کی ایک بات یاد آگئی۔ انہوں نے ہنستے ہنستے کہا۔ بڑے بڑے اشومیگھ یگ کیا کرتے ہیں۔ آج میں شاعری اور کوتا کا یگیہ کر رہا ہوں۔ انہوں نے سوچا۔ کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہوئی۔ اشومیگھ کا گھوڑا جب ساری دنیا کا چکر لگا کر واپس آجاتا ہے۔ جب یگیہ ہوتا ہے۔ اور میں شکست کھا کر کوتا یگیہ کر رہا ہوں اگر کچھ دن پہلے کرتا تو اچھا تھا۔

ایک ایک کر کے انہوں نے اپنے منجلی گرنتھوں کو آگ میں ڈال دیا۔ آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھ کر کوی جی دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہنے لگے۔ تمہاری نذر کر دیا ہے خوبصورت آگ تمہاری ہی نذر کر دیا۔ اتنے دن سے تمہیں تھوڑی بہت تھوڑی کھانڈ کی قربانی دیتا چلا آرہا تھا۔ آج یکدم سب کچھ قربان کر رہا ہوں۔ نے موہن اسے آگ میں قابل ہوتا۔ تو آج چمک جاتا۔ لیکن میں حقیر ہوں۔ اسی سے آج جل کر راکھ ہو گیا۔

رات زیادہ گزر گئی۔ شیکھر نے اپنے گھر۔ سب دروازے کھول دیئے وہ جن پھولوں کو پسند کرتے تھے۔ انہیں سر شام ہی باغ سے چن لائے تھے۔ خوبصورت خوشبودار پھول تھے کوی نے وہی پھول اپنے صاف ستھرے

بچھونے پر بچھا دئے۔ گھر میں چاروں طرف دیپک جلا کر رکھ دیئے۔
اس کے بعد شہد میں درخت کا زہریلا پانی ملا کر چاٹ لیا۔ پھر آہستہ آہستہ
اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ رہے۔ جسم بے حس سا ہو چلا۔ آنکھیں بند ہونے
کو آئیں۔

چھا نجر بجے۔ شمالی ہوا کیسا تھ کسی کی عنبریں زلفوں نے اس نگر میں قدم
رنجہ فرمایا۔ کوی نے آنکھیں بند کئے ہی کہا۔ دیوی ——— کیا بھگت
پر مہربانی کی ہے۔ اتنے دنوں کے بعد کیا آج درشن دینے آئی ہو۔
شیریں آواز میں جواب ملا۔ ہاں کوی ورمن آئی ہوں۔ شیکھر نے چونک
کر آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا پلنگ کے پاس ایک خوبصورت عورت
کھڑی ہے۔ مدت کی چھایا سے بھری ہوئی آنکھوں سے کچھ صاف دکھائی نہ دیا
انہیں ایسا معلوم ہوا۔ کہ ایک خیالی تصویر جو مدت مدید سے ان کے دل کے
مندر میں براجمان تھی۔ آج انکی موت کیوقت باہر آ کر ان کے سامنے کھڑی حیرت
استعجاب سے انہیں دیکھ رہی ہے۔ عورت نے کہا میں راجکماری اپراجتا
ہوں۔ کوی جی جان سے کوشش کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ راجہ نے
انصاف سے آج کام نہیں لیا۔ فتح تمہاری ہی ہوئی ہے۔ معزز کوی
اسی سے آج میں تمہیں اس وقت جے مالا پہنانے آئی ہوں۔
یہ کہکر اپراجتا نے اپنی بنائی ہوئی پھولوں کی مالا اپنے گلے سے اتار کر شیکھر
کو پہنا دی۔ شاعر شیکھر کا بے جان جسم پلنگ پر دھڑام سے گر پڑا۔

سماج کی بھینٹ

پانچ لڑکوں کے بعد لڑکی پیدا ہونے پر ماں باپ نے اس کا نام دلاری رکھا۔ اس گھر میں ایسا فیشن ایبل نام کبھی کا نہیں تھا۔ صرف دیوتاؤں کے نام پر ہی سب نام رکھے جاتے تھے۔ مثلاً گنیش۔ درگا۔ گنگا گوری۔ گوردھن وغیرہ۔

دلاری جب قابل شادی ہوئی۔ تو اس کے باپ پنڈت گوردھن داس نے لڑکے کے لئے بہت چھان بین کی۔ لیکن گردو نواح میں کوئی ایسا لڑکا نہ مل سکا۔ جسے ان کا دل پسند کرے۔ بالآخر بہت دوڑ دھوپ کے بعد ایک وکیل صاحب کا لڑکا من کو بھا گیا۔ لڑکے کے وکالت اور کالج پڑھنے پر بہت سا روپیہ خرچ ہو چکا تھا۔ اس لئے خاندان کوئی بہت خوشحال نہ تھا۔ لڑکے کے باپ درگا شنکر پچھلے کئی سالوں سے وکالت کرتے تھے۔ لیکن اس دوران میں انہیں ایک بھی ایسا کیس نہ ملا جس میں وکیل بننے کی انہیں خود کوشش نہ کرنا پڑی ہو۔

بہرحال بابو درگا شنکر وکیل نے پنڈت گوردھن سے تین ہزار روپیہ نقد اور دو ہزار کے زیورات جہیز میں مانگے۔ سن کر ایکبار تو گوردھن کو تعجب ہوا۔ ان کا خیال تھا۔ کہ وکیل صاحب پڑھے لکھے سمجھدار اور ہی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے والے ہیں۔ سودا کرنے میں اتنی سختی نہ کرینگے۔ ہچکچاتے ہوئے ایک آدھ بار انہوں نے کچھ کم کرنے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ سب کچھ وکیل صاحب نے ہنسی میں ہی اڑا دیا۔

پنڈت گوردھن داس کے دس ہزار روپے پیپلز بنک میں تھے۔ گھر بار ملاکر چھ سات ہزار کی جائیداد بھی تھی۔ وہ خود وئید تھے۔ لین دین بھی کرتے تھے۔ اچھی آمدنی تھی۔ دروازے پر جاکر لوٹنا۔ اور ایسے گھر ور کو ہاتھ سے جانے دینا ٹھیک نہ سمجھکر انہوں نے بابو درگا شنکر کی پیشکش قبول کرلی۔

تقدیر کو ہم ایک چکر سے مناسبت دے سکتے ہیں۔ ایک آدمی کی قسمت آج اونچی ہے۔ تو کل ضرور گر جائے گی۔ سگائی کے ہفتہ عشرہ بعد گوردھن پنڈت کی تقدیر نے بھی پلٹا کھایا۔ پیپلز بنک دیوالیہ ہو گیا۔ بچارا گوردھن کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ لیکن تھا بڑا ہی دور اندیش۔ لگ دو ہزار کے زیورات گھر میں تھے۔ اس لئے گہنوں کے لئے انہیں اتنی فکر نہ تھی۔ انہیں اب سوچ تھی۔ تو تین ہزار نقدی کی۔ بیاہ دن بدن نزدیک آرہا تھا۔

انہوں نے سوچا۔ لڑکی کی شادی تو کرنا ہی ہے یہ خیال آیا۔ اگر اب کے معاملہ رہ گیا۔ تو پھر ایسا لڑکا ہاتھ لگنا مشکل ہے۔ بڑی تگ و دو کے بعد پانچسو کے قریب روپیہ انہوں نے اپنے قرضخواہوں سے وصول کیا۔ دو ہزار روپے زمین اور باغ گروی رکھکر ہاتھ آئے۔ اب بھی ڈیڑھ ہزار کی کسر تھی کیونکہ ایک ہزار روپیہ برات کی خاطر و مدارات اور دیگر مراحل طے کرنے کیلئے درکار تھا۔ کل چار ہزار روپیہ چاہیئے تھا۔

بیاہ کا دن آگیا۔ ایک آدمی نے بھاری سود کے بدلے ڈیڑھ ہزار روپیہ

قرض دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن ٹھیک وقت پر اس نے کہدیا۔ کہ روپیہ نہیں ہے۔

ادھر وکیل صاحب نے عجیب کھیل کھیلا۔ گوردھن پنڈت کو پیغام بھیجا کہ روپیہ اور زیورات پہلے ہمیں بھجوادو۔ تب لڑکا شادی کا بندھن پہنے گا۔ گوردھن پنڈت ڈیڑھ ہزار روپیہ نقد اور دو ہزار کے زیورات لے کر گئے۔ اور جاتے ہی وکیل صاحب کے پاؤں پکڑ کر بولے اب میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بیاہ ہو جانے دیجئے۔ باقی ڈیڑھ ہزار میں بعد میں چکا دونگا۔ لیکن ان کی یہ سب عجز وانکساری۔ منت وسماجت صدا بہ صحرا ثابت ہوئی وکیل صاحب نے صاف صاف کہدیا۔ کہ طے شدہ رقم حاصل کئے بغیر شادی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ گوردھن نے بنک کے فیل ہو جانے کا واقع بیان کرکے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "تو پھر شادی کے لئے اتنے بیتاب کیوں ہو۔ جب روپے ہوئے تب کرلینا۔" وکیل صاحب نے کہا۔

درحقیقت وکیل صاحب کو بنک فیل ہو جانے والی بات پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے سمجھا۔ کہ دغاباز کہانی بنا کر تھوڑی رقم سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ اس ناخوشگوار وقوعے سے پنڈت گوردھن کے گھر پر اداسی سی چھا گئی۔ اس سب اداسی۔ غمی اور بے عزتی کی واحد ذمہ دار لڑکی بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی۔ اپنے سسر پر اسے عقیدت تھی۔ یا نفرت۔ یہ اس کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔

اس دوران میں وکیل صاحب کا لڑکا اپنے باپ سے بول پڑا۔ اور کہا۔ میں روپے پیسے کو کچھ نہیں جانتا۔ بیاہ طے ہوا ہے۔ اور اب ضرور ہوگا۔ باپ نے باراتیوں سے کہا۔ دیکھتے ہیں آپ لوگ آج کل کے چھوکروں کا حال۔

جواب میں وکیل صاحب کے چند ہمخیال بڈھوں نے کہا۔ کلجگ ہے بابا کلجگ۔ لیکن نئی روشنی کے لوگ کچھ نہ بولے۔

باپ کے بہت کچھ کہنے سننے پر بھی لڑکا نہ مانا۔ اور چاروناچار شادی ہو ہی گئی۔ سسرال جاتے وقت ماں باپ دلاری کو سینے سے لگا کر رونے لگے۔ دلاری نے پوچھا۔ وہ لوگ کیا اب مجھے یہاں نہ آنے دیں گے دلوا گوردھن نے کہا۔ آنے کیوں نہ دیں گے۔ بیٹی میں خود تمہیں لے آؤں گا۔

بیاہ کے بعد پنڈت گوردھن اکثر لڑکی کو دیکھنے اس کے گاؤں جایا کرتے لیکن وہاں ان کی کچھ عزت نہ تھی۔ انہوں نے اسی خیال سے تو شہر میں تھوڑے ہی فاصلے پر لڑکی کی شادی کی تھی۔ کہ جب چاہیں گے۔ مل آیا کریں گے۔ یا بلالیں گے۔ لیکن جو سلوک اب ان سے یہاں ہوتا تھا۔ اس کا انہیں خواب بھی گمان نہ تھا۔ وکیل صاحب کے گھر کے معمولی نوکر بھی۔ انہیں نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

بیٹھک خانے سے ملحقہ ایک چھوٹا سا الگ مکان تھا۔ وہیں انہیں پانچ سات منٹ کیلئے اپنی لڑکی دیکھنے کیلئے بلجاتی تھی۔ اور کبھی تو محض ذلت

اور مایوسی کا مُنہ دیکھنا پڑتا۔

لڑکی کے سسرال میں اپنی توہین ـــــ گوردھن پنڈت کا دل اسے برداشت نہ کرتا تھا۔ انہوں نے سوچا۔ جسطرح ہو۔ جہیز کے تین ہزار دینے چاہئیں۔ لیکن ادھر پہلا قرض سر پہ ہے۔ اور اس کا سُود گھوڑے کیطرح دوڑ رہا ہے۔ ڈیڑھ ہزار روپے جو وکیل صاحب نے واپس کر دئے تھے۔ وہ بھی اب تک خرچ ہو چکے تھے۔ ان دنوں حکمت بھی خاص اچھی نہ چلتی تھی۔ اور مہاجنی بھی روپیہ نہ ہونے کے باعث بند پڑی تھی۔ جن آسامیوں کا روپیہ ابھی ان کی طرف بقایا تھا۔ ان کی نظر سے بچنے کیلئے انہیں طرح طرح کے بہانے تراشنے پڑتے تھے۔

ادھر سسرال میں لڑکی کو اُٹھتے بیٹھتے گالیاں ملتی تھیں۔ باپ کے گھر کی توہین سن کر۔ دروازہ بند کر کے۔ کوٹھڑی میں جا کر رونا اس کا معمول ہو گیا تھا۔ ساس کی کھینچ تو کسی طرح مٹتی نظر ہی نہ آتی تھی۔ اگر کوئی لڑکی کا مُنہ دیکھ کر کہتا۔ واہ کتنی خوبصورت ہے۔ تو پاس بیٹھی ہوئی جھٹک کر کہتی۔ خوبصورتی تو بس ظاہر ہو ہی رہی ہے۔ جیسے گھر کی لڑکی ویسا ہی جہیز یہاں تک کہ بہو کے کھانے پینے میں بھی اتنا دھیان نہ دیا جاتا۔ اگر کوئی پڑوسن رحم کرتے ہوئے بہو کی طرفداری کر کے..... اس کی ساس سے کچھ کہتی۔ تو جواب میں بڑھیا کہتی۔ ہم کوئی اس سے بے انصافی نہیں کر رہے ہیں۔ اگر اس کا باپ پوری رقم دیتا۔ تو یہاں بھی اس کی پوری دیکھ بھال ہوتی

گھر کے نوکر چاکر بھی ہر بات میں ٹال مٹول کر دیتے تھے۔ گویا دلاری کا اس گھر میں رتی بھر بھی حق نہیں۔ جیسے زبردستی وہ اس مکان میں گھس آئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنی لڑکی کی توہین وغیرہ کی خبر پنڈت گوردھن کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس لئے وہ اپنے رہائشی مکان کو فروخت کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن انہوں نے اپنے لڑکوں پر یہ بات ظاہر نہ کی۔ کہ وہ انہیں گھر سے بے گھر بنا رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ مکان بیچ کر اسی مکان میں کرایہ پر رہیں گے۔ اور ایسے رنگ ڈھنگ رکھ جائیں گے۔ کہ مرنے سے پہلے لڑکے یا کسی اور رشتہ دار پر یہ بات ظاہر نہ ہو گی۔

لیکن ان کے لڑکوں کو یہ بات پتہ لگ ہی گئی۔ اور وہ آ کر رونے دھونے لگے۔ ان کے دو بڑے لڑکے بیاہے ہوئے تھے۔ اور سب سے بڑے کے دو بچے بھی تھے۔ ان کے شور و غل مچانے سے گھر کی فروختگی رک گئی تب سے پنڈت گوردھن جگہ جگہ سے زیادہ سود دیکر۔ تمسک لکھکر۔ قرض لینے لگے۔ آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ گرہستی کا خرچ چلنا بھی مشکل ہو گیا۔

اپنے باپ کا چہرا دیکھکر دلاری یہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس کے اندر کی طرف پچکے ہوئے گال۔ سوکھا ہوا چہرا۔ اور زرد ہونٹوں نے دلاری پر صاف ظاہر کر دیا۔ جب کبھی گوردھن لڑکی کو دم بھر کے لئے اس کے سسرال میں دیکھ لیتے۔ تو ان کی بناوٹی ہنسی اور مصنوعی خوشی کو دیکھکر صاف پتہ

چل جاتا۔ کہ ان کا دل فکر اور خوف کے مارے پھٹا جاتا جاتا ہے۔
باپ کے ٹوٹے ہوئے دل کو ڈھارس بندھانے کے خیال سے ولاری نے چند دنوں کیلئے میکے جانے کا ارادہ کیا۔ چند دنوں کے بعد جب باپ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ تو بولی۔ بہت دن اماں کو نہیں دیکھا۔ انہیں ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ گوردھن نے کہا۔ اچھا میں تمہیں جلدی ہی بلا لوں گا۔

کہنے کو تو گوردھن نے یہ الفاظ کہہ دیئے۔ لیکن لڑکی کو لے جانے کا انہیں کوئی حق نہ تھا۔ یہ روگ ان کے بس کا نہ تھا۔

لڑکی پر باپ کا جو قدرتی اور نہ ٹوٹنے والا حق ہوتا ہے۔ گوردھن نے جیسے اس حق کو جہیز کے تین ہزار روپے کے عوض گروی رکھ چھوڑا تھا۔ یہاں تک کہ بیٹی کو ملنے کے لئے انہیں بعض اوقات بہت خفت اٹھانا پڑتی تھی۔ لیکن وہ مجبور تھے کیا کرتے۔

لیکن اب ——— جب لڑکی خود میکے جانے کے لئے کہہ رہی ہے تو باپ سے کیسے رہا جاتا۔ وکیل صاحب کے سامنے درخواست کو پیش کرنے سے پہلے انہوں نے عزت۔ بے عزتی اور نقصان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اٹھارہ صد روپیہ جمع کر لیا۔ کس طرح جمع کئے۔ اس معاملہ پر روشنی ڈالنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

سو سو کے اٹھارہ نوٹ رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لئے۔ اور

اور وکیل صاحب کے پاس جا کر نمستے کہہ کر بیٹھ گئے۔ پہلے ہنستے ہوئے محلہ کے تازہ واقع کو لیا۔ کہ رادھا کرشن کے گھر ایک چوری ہوگئی ہے۔ وکیل صاحب نے تفصیل پوچھی۔ تو شروع سے لیکر سارا واقعہ کہہ سنایا۔ پھر باتوں باتوں میں کہا۔ آپ کے تین ہزار روپے میرے ذمہ نکلتے ہیں۔ ہر بار آپ کے ہاں آنے سے پہلے۔ ساتھ لے آنے کے لئے سوچتا ہوں لیکن عین وقت پر بھول جاتا ہوں۔ بوڑھا ہوگیا ہوں نہ۔ اسطرح بہت لمبی چوڑی تمہید کے بعد۔ گوردھن نے وہ نوٹ کوٹ کی جیب سے بڑی آہستگی سے نکالے۔ صرف اٹھارہ سو کے نوٹ دیکھکر وکیل صاحب زور سے ہنسے۔ پنڈت جی رہنے دیجئے۔ مجھے اب ان روپوں کی ضرورت نہیں۔ میں گناہ کا مستوجب نہیں ہونا چاہتا۔

اس کے بعد گوردھن زبان سے ایک لفظ تک نہ نکال سکے۔ قریباً پندرہ منٹ کے بعد قفل خاموشی کو توڑتے ہوئے نہایت عاجزانہ انداز میں دلاری کو چند دنوں کے لئے میکے بھیجنے کی بات شروع کی۔ بغیر کوئی وجہ بتائے وکیل صاحب نے کہا۔ یہ تو ابھی ہو نہیں سکتا۔ اور گاڑی پر سوار ہو کر چلے گئے۔ اس دن پنڈت گوردھن اپنی لڑکی کو نہ ملے۔ اس کے پاس جاتے بھی تو کون سا منہ لے کر۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کو جیب میں رکھ لیا۔ اور گھر لوٹ آئے۔ انہوں نے دل میں فیصلہ کر لیا۔ کہ جب تک تین ہزار روپے وکیل صاحب کو ادا نہ کر

دوں گا۔ تب تک ان کے ہاں نہ جاؤں گا۔

بہت دن گزر گئے۔ وتاری نے پیغام پر پیغام اور آدمی پر آدمی بھیجے لیکن پنڈت گوردھن ایکبار بھی ملنے نہ آئے۔ آخر میں روٹھ گئی۔ اور پیغام و آدمی بھیجنے بند کر دیئے۔ تب گوردھن کے کلیجے پر کڑی چوٹ لگی۔ لیکن اکڑ گئے پھر بھی نہیں۔

ساون کا مہینہ آگیا۔ پنڈت گوردھن نے پکا فیصلہ کر لیا۔ کہ جھولوں کے میلہ پر وتاری کو ضرور اپنے گھر لاؤں گا۔ اس کیلئے انہوں نے قسم کھالی۔ اس کے چند دن بعد تین ہزار کے نوٹ کمر میں باندھ کر پنڈت گوردھن وکیل صاحب کے ہاں چلے۔

پانچ برس کے پوتے نے ٹانگوں میں لپٹ کر کہا۔ دادا میرے لئے گاڑی لینے جاتے ہو۔ بہت دنوں سے پونڈا ہٹھ گاڑی کیلئے ضد کر رہا تھا۔ لیکن ہاتھ تنگ ہونے کے باعث پنڈت گوردھن اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے تھے۔

چھ برس کی پوتی نے روتے ہوئے آکر کہا۔ بابا مجھے لہریئے دار ریشمی دھوتی لادو ——— منہ میں پان لئے پنڈت گوردھن انہیں تفکرات میں غرق تھے۔ انہوں نے اپنے عزیزوں کی حسرتوں کا خون ہوتے۔۔ اکثر دیکھا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتے۔ مجبور تھے۔ ایک محلہ کی لڑکی کی شادی پر ان کی بہو پرانے کپڑے پہن کر جائیگی۔ یہ بات انہیں کھائے جا رہی

تھی ـــــــــــ اس سب کچھ کے باوجود کنبہ کی ضروریات کو بالائے طاق رکھکر عزیزوں کی التجاؤں کو سنا۔ ان سنا کر کے وہ وکیل صاحب کے ہاں گئے۔

وہاں پہنچکر نوکروں سے معلوم ہوا۔ وکیل صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ آج پنڈت گوردھن مطمئن تھے۔ آج اس گھر کے نوکر انہیں قابل نفریں نہ دکھائی دیتے تھے۔ جیسے آج وہ اپنے ہی گھر آئے ہیں۔ آج وہ خوش تھے۔ آج ان کی ایک پرانی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ بیٹھک میں بیٹھکر وکیل صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ یہاں پنڈت جی سے نہ رہا گیا۔ ملاقات کیلئے بیٹی کو پیام بھیجا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ باپ بیٹی دونوں رو رہے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بات نہ کر سکا۔ کچھ دیر کے بعد گوردھن نے کہا۔ بیٹی تھوڑی دیر میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔

اچانک اسی وقت گوردھن پنڈت کا بڑا لڑکا اپنے دونوں بچوں کو لئے اس کمرہ میں داخل ہوا۔ باپ کو دیکھکر اس نے آہستگی سے کہا۔ دادا اب کیا ہم لوگوں کے رہنے کا ٹھکانہ بھی نہ رہے گا۔

اپنے لڑکے کو وہاں دیکھکر پنڈت گوردھن آگ بگولہ ہو گئے۔ سخت لہجہ میں بولے۔ تو کیا تمہارے لئے میں اپنے آپ کو جہنمی آگ کے حوالے کر دوں تو کیا تم میری پرتگیا کو پورا نہ ہونے دو گے۔

پنڈت گوردھن اپنا گھر بیچ آئے تھے۔ لڑکوں سے انہوں نے اس بات کو چھپانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن بڑے کو اس کی خبر ہو ہی گئی۔

پوتے نے آگے بڑھکر گوردھن کے دونوں گھٹنے پکڑ کر کہا۔ دادا کیا گاڑی نہیں لائے۔

دادا نسر جھکائے ایک طرف کھڑے تھے۔ بچّے کے استفسار کے باوجود بھی وہ بت کے بنے کھڑے رہے۔ تو بچہ دلاری کے پاس جاکر بولا۔ بوّا کیا تم مجھے ایک گاڑی لے دوگی۔

اپنے بڑے بھائی کی باتیں سن کر دلاری پر سب کچھ واضح ہو گیا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ دادا اگر آپ ایک کوڑی بھی میرے سسر کو دیں گے تو میں آپ کا ماتھا چھو کر کہتی ہوں۔ کہ میں اپنی جان دے دونگی۔

گوردھن داس نے کہا۔ چھی چھی ایسا نہ کہو بیٹی۔ اگر میں یہ روپیہ نہ دونگا تو تمہارے علاوہ اس میں میری بھی ہتک ہے۔

دلاری نے مضبوط ارادے سے کہا۔ اگر آپ روپیہ دیں گے۔ تو بھی آپ کی بے عزتی ہوگی۔ میں کہا صرف روپے کی تھیلی ہوں دادا یہ روپئے دیکر میری بے عزتی نہ کرائیے۔ اس کے علاوہ اس روپیہ پر جن کا حق ہے۔ وہ تو اسے چھونا بھی نہیں چاہتے۔

گوردھن نے کہا پھر یہ لوگ تمہیں جانے نہ دیں گے بیٹی۔

دلاری بولی۔ نہ جانیں گے تو کیا ہوا۔ دادا۔ آپ مجھے بلانے کی کوشش ہی نہ کریں۔

تب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گوردھن نے نوٹ جیب میں رکھ لئے

اور ایک چور کیطرح سب کی نظروں سے بچ کر چلدیئے۔ لیکن یہ بات وکیل صاحب اور ان کی دھرم پتنی سے چھُپی نہ رہ سکی۔ کہ گوردھن داس روپے دینے آئے تھے۔ لیکن لڑکی کے روکنے پر واپس لوٹ گئے۔

گھر کی ایک مہاراجن نے باپ بیٹی کی گفتگو سن لی تھی۔ اس نے اسی وقت مالکن کے کان بھر دیئے۔ سنتے ہی ساس کا منہ لال سُرخ ہوگیا دلاری کے لئے اسکی سسرال وادیٔ جہنم بن گئی۔ ادھر اس کا خاوند تحصیلدار ہوکر کسی دوسرے شہر چلا گیا تھا۔

ساس نے دلاری سے اس کا بدلہ لینے کیلئے اس کے میکے کے ہر ایک آدمی سے اس کا ملنا جلنا بند کردیا۔ اسی دوران میں دلاری بیمار سی رہنے لگی۔ لیکن اس کی اس تمام تر بیماری کا باعث اس کی ساس کو نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ وہ اپنی دیکھ بھال سے بھی لاپرواہ تھی۔

رات زمین پر ہی سو جاتی۔ سردی سے بچنے کے لئے شاید ہی کبھی اس نے شال اوڑھا ہوگا۔

وکیل صاحب کی موسی کی بیوہ لڑکی بھی انہیں کے ہاں رہتی تھی۔ دلاری اور سب کو کھانا پلانا اسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی کھانے پر بلانے سے بھول جاتی۔ اور ایسے دنوں میں اکثر بہو بھوکی ہی سو جاتی۔ لیکن بہو کی یہ عادات ساس کو پسند نہ تھیں۔ اگر کھانے کیوقت اس کا چہرا

کبھی اوداس ہوتا۔ تو کہتی۔ نواب کی بیٹی ہے نہ غریب کے گھر کا کھانا اسے پسند نہیں۔ سمجھی بہتیں دیکھو دن بدن کیسی دبلی ہوتی جا رہی ہے۔ جیسے کھانے کو کچھ ملتا ہی نہیں۔ جب دلاری زیادہ بیمار ہو گئی۔ تو ساس نے کہا۔ بیماری تو کم ہے بتاتی ہے زیادہ۔

بالآخر نہایت انکساری سے دلاری نے ساس سے کہا۔ اماں۔ ماتا پیتا اور بھائیوں سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ ساس نے کہا۔ اب میں سمجھ گئی۔ یہ سب بیماری میکے جانے کی ہے۔ پہلے پہل جب دلاری کو بخار آیا تھا تب ایکدفعہ ڈاکٹر آیا تھا۔ اس کے بعد اسے بلانے کی ضرورت نہ پڑی۔

وکیل صاحب کی بڑی بہو دلاری مرگئی۔ دھوم دھام سے اس کا کریا کرم کیا گیا۔ چندن کی چتا پر اسکی لاش جلائی گئی۔ وکیل صاحب نے اتنا خرچ شاید لڑکے کے بیاہ پر بھی کیا تھا۔ جتنا اس موقع پر کیا۔

پنڈت گوردھن داس کے پاس جو لوگ اس کی لڑکی کے مرنے کی خبر پر افسوس کرنے آئے۔ ان سب نے کہا۔ کہ وکیل صاحب نے بہو کی موت پر جیسا کریا کرم کیا ہے۔ علاقہ بھر میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اس کے علاوہ کسی عورت کا اس کے خاوند کی زندگی میں مر جانا اس کی خوش قسمتی ہے۔

ادھر تحصیلدار صاحب (دلاری کے خاوند) نے لکھا۔ یہاں میں نے سب بندوبست کر دیا ہے۔ دلاری کو یہاں بہت جلد بھیجو۔

وکیل صاحب کی بیوی نے جواب میں لکھوا بھیجا۔ بہو سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ تمہارا دوسرا بیاہ ٹھیک کر لیا ہے۔ چھٹی لے کر چلے آؤ۔ اب کے تمہارے سسرال سے پانچ ہزار روپے نقد اور اتنے ہی کے زیورات ملیں گے۔

جَاسُوسُ

میں پولیس کا جاسوس ہوں۔ میری زندگی کے صرف دو ہی نصب العین ہیں۔ ایک میری بیوی۔ اور دوسرا اپنا روزگار۔ پہلے ہم دونوں بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن اپنی بیوی کی عزت میں کچھ کمی دیکھ کر بڑے بھائی سے لڑ جھگڑ کر میں جدا ہو گیا۔ بڑے بھائی ہی کماتے اور کنبہ کی پرورش کرتے تھے...... اچانک اپنی بیوی کو لے کر ان سے جدا ہونا۔ یقیناً میرے جلد باز اور ناعاقبت اندیش ہونے کا ثبوت ہے۔

لیکن ایسا کبھی بھی نہیں ہوا۔ کہ مجھے اپنے پر بھروسہ نہ رہا ہو۔ اس بات کو میں بخوبی جانتا تھا۔ کہ اپنی خوبصورت بیوی کو جس طرح میں نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اسی طرح دولت کی دیوی کو جو آج مجھ سے دُور دُور ہے۔ کو ایک دن قابو میں کر لوں گا۔ شونا تھ اس دنیا میں کسی سے کبھی پیچھے نہیں رہ سکتا۔

محکمہ پولیس میں پہلے معمولی آسامی ملی۔ لیکن جاسوسی کے صیغہ میں گھُستے مجھے کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔

صاف شفاف چراغ سے ہی جیسے کاجل گرتا ہے۔ ویسے ہی میری بیوی کی محبت سے وفا اور محبت ٹپکتی تھی۔ اور یہ میرے کام میں کبھی کبھی حائل ہو کر رہ جاتی۔ کیونکہ پولیس کی ملازمت کرکے جگہ بجگہ اور وقت بوقت کا خیال نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اچھی جگہ کی بجائے بُری برُی اور اچھے وقت کی جگہ بے وقت پر ایسا ہی اکثر و بیشتر کرنا پڑتا ہے۔

اس سے میری بیوی کی محبت اور عقیدت اور بھی اُبل سی پڑتی تھی۔ وہ مجھے دھمکانے کے لئے کہتی تھی۔ تم یہ جو اس طرح جب تب۔ جہاں تہاں ٹھہر جاتے ہو۔ کئی کئی مہینوں کے بعد گھر آتے ہو۔ تمہیں کیا کچھ کھٹکا نہیں ہوتا؟"

میں اس سے کہتا تھا" شک کرنا تو ہمارا پیشہ ہے۔ اسی وجہ سے میں اسے گھر میں اندر نہیں لاتا"

میری بیوی کہتی تھی" شک کرنا میرا پیشہ نہیں۔ یہ میری عادت ہے اگر شک کرنے کا تم مجھے ذرا بھی موقع دوگے۔ تو میں سب کچھ کر سکتی ہوں"

میری یہ ازحد خواہش تھی۔ کہ جاسوسی میں سب سے زیادہ نام ہوری کا حاصل کروں گا۔ اپنے آپ کو سب سے بڑھ کر ثابت کر کے دکھاؤں گا۔ جاسوسی کی اس کو ئی کہانی نہ تھی۔ جسے میں نے پڑھا نہ ہو۔ اور کوئی ایسا واقع نہ تھا جسے میں نے سُنا نہ ہو۔ لیکن اس محنت میرے دل کی بے چینی اور بے قراری بڑھنے لگی۔

کیونکہ ہمارے ملک کے جرائم پیشہ اشخاص ڈرپوک اور بے وقوف ہوتے ہیں۔ ان میں پیچیدگی۔ اور طبیعت نام کو بھی نہیں ہوتی۔ ہمارے ملک کا خونی۔ اپنے جرم کو کسی طرح بھی چھپا نہیں سکتا۔ جہاں جیسے وہ پھینکتا ہے۔ خود ہی بہت جلد اس میں پھنس جاتا ہے۔ جرم کے گھیرے سے نکلنے کی راہوں کا وہ عشر عشیر بھی نہیں رہتا تا۔ ایسے بے کیف ملک

میں جاسوسی کے کام میں نہ راحت ہے۔ اور نہ ہی کچھ بڑائی۔
بڑے بازار کے مارواڑی ٹھگ کو ہر موقع پر فوراً ہی گرفتار کر کے نہ
جانے کتنی دفعہ میں نے اپنے دل میں کہا ہے" او نالائق اور جاہل مجرم
دوسروں کو لوٹنا۔ اور ان کا ستیاناس کرنا۔ بڑی قابلیت اور استادی کا
کام ہے۔ تم جیسے اناڑی بیوقوف کو ساد معو پیری ہونا چاہیئے تھا" اسی
طرح خونی کو گرفتار کر کے میں نے دل ہی دل میں اس سے کہا ہے" حکومت
نے پھانسی کا رسہ کیا تم جیسے جاہل۔ بے شعور اور مردہ دل کے لئے ہی بنایا
ہے۔ تم لوگوں میں نہ جسمانی طاقت ہے۔ اور نہ ہی دماغی قوت۔ پھر تم خونی
بننے کی خواہش کیسے کرتے ہو"
تصور میں جب کبھی میں لندن اور پیرس شہر کے رہگیروں سے بھرے
ہوئے بازار۔ کبھی خالی نہ رہنے والی راہیں۔ اور آسمان سے باتیں کرنے
والی عمارتیں دیکھ پایا ہوتا۔ تو میرے دل میں ایک ہل چل سی مچ جاتی
تھی۔ میں سوچتا تھا۔ ان عمارتوں۔ سڑکوں اور گلیوں میں جیسے بیوپاری
لوگ۔ سیلانی لوگ۔ ملازم لوگ۔ مزدور لوگ۔ اور دیگر طرح طرح کے
لوگ دن رات چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح یقیناً ان سب کے ساتھ
ساتھ دنیا کی نظروں سے بچ جرائم پیشہ اشخاص بھی یقیناً اپنا کام کرتے
رہتے ہیں۔ اور ان جرائم کے انسداد کے لئے یورپ کے دانشمندوں
نے وہ وہ طریقے بنا رکھے ہیں۔ جنہیں سن کر عقل دنگ سا رہ جاتی ہے۔

اور ہمارے کلکتے کی سڑک گے آس پاس کے کھلی کھڑکی والے مکان میں کھانا۔ پکانا اور کام کاج۔ امتحان کی تیاری کرنا۔ تاش شطرنج کی بیٹھک عورت مرد کا جھگڑا۔ زیادہ سے زیادہ بھائیوں میں جھگڑا۔ اور مقدمے بازی کی صلاح کے سوا کوئی قنلیبات چیت نہیں۔ کسی گھر کیطرف دیکھ یہ بات خیال میں نہیں آتی۔ کہ شاید اس کھڑکی اس گھر کے اندر کوئی شیطان چپ چاپ اپنا کام کر رہا ہے۔

میں اکثر راہ میں آنے جانے والے کی چال اور ان کے چہروں کیطرف بغور دیکھا کرتا تھا۔ جن کا چہرا یا رنگ ڈھنگ کچھ بھی مشکوک معلوم ہوا۔ ان کا اکثر میں نے چھپ کر تعاقب کیا۔ ان کے نام پیشہ اور چال چلن وغیرہ کو ادھر ادھر سے دریافت کیا۔ لیکن انجام کار۔ نہائیت کیساتھ مجھے یہ معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے عزیز و اقربا بھی ان کی عدم موجودگی میں ان پہ کوئی تہمت یا الزام نہیں لگاتے راستہ چلنے والوں میں جو مجھے سب سے بدمعاش نظر آیا۔ یہاں تک کہ جسے دیکھ کر میں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ یہ آدمی ضرور ابھی کوئی خلاف قانون کام کر کے آ رہا ہے۔ اسی کے متعلق تحقیق کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ کسی سکول کا ماسٹر ہے۔ ابھی سکول سے لوٹ کر گھر واپس جا رہا ہے۔ یہی سب آدمی کسی اور ملک میں پیدا ہوتے۔ تو نامور چور اور ڈاکو ہو سکتے تھے۔ لیکن بے حسی۔ بے جانی۔ اور خیالات کی کمزوری نے انہیں محض ایک

ایک سکول کا مدرس بنا دیا۔ عمر کے آخری حصہ میں پنشن پر گزارا کرتے رہے اور بالآخر اسطرح مر گئے۔ بہت کوشش تجسس اور مطالعہ کے بعد جتنی نفرت مجھے اس ماسٹر سے ہوگئی۔ اتنی تو کسی لوٹا تھالی چرانے والے سے بھی نہیں ہو سکتی۔

انجام کار ایک دن شام کے وقت اپنے گھر کے پاس ہی ایک گیس بود کے نیچے میں نے ایک آدمی کو دیکھا۔ وہ بلا کسی ضرورت کے اِدھر اُدھر تاکتا ہوا چکر لگا رہا تھا۔ اس کو دیکھکر مجھے شک ہوا کہ یہ یہاں کسی بری نیت سے ٹہل رہا ہے۔ خود اندھیرے میں کھڑے ہو کر میں نے اس کے چہرے کو بہت اچھی طرح سے دیکھ لیا۔ وہ نوجوان اور دیکھنے میں خوبصورت بھی تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ برے کام کرنے کے لائق بالکل یہی چہرا ہے۔ اپنا چہرے ہی جن کے مجرم ہونے کا کافی ثبوت ہے وہ جرم کرنا بالکل چھوڑ دیں۔ نیک ہو کر شاید وہ دنیا میں کچھ بنا سکیں لیکن برا بنا کر ایک دم بھی بآرام گزارنا ان کے ناممکن ہے۔ میں نے دیکھا ہے اس جوان کمینے اس کا چہرا ہی سب سے بڑھ کر اس کا امدادی ہے۔ میں نے کہا جو نیک چہرا ملا ہوا ہے۔ اگر تو اسے اچھے کام لگا سکے۔ تو میں تمہیں شاباش کہوں گا۔

اندھیرے سے ایک دم سامنے آ کر اس کی پیٹھ پر تھپکی مار کر میں نے کہا۔ کہو دوست اچھے تو ہو۔ وہ تو ایک دم چونک کر میری طرف

تاکنے لگا۔ میں نے کہا۔ معاف کرنا مجھ سے بھول ہوگئی۔ میں نے تمہیں دوسرا آدمی سمجھا تھا۔ اپنے دل میں کہا۔ میں نے کچھ بھی غلطی نہیں کی جو سمجھا تھا۔ وہی ہے۔ لیکن تیرا۔ اس طرح زیادہ چونک پڑنے کا ڈھونگ ٹھیک نہیں ہوا۔ اس سے مجھے اس کی شرافت میں شک سا پڑ گیا۔ اسے اپنے آپ پر پورا پورا اختیار ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن مجرم پیشہ اشخاص میں پوری شرافت اور انسانیت کم پائی جاتی ہے چور کو بھی پکا چور بنانے میں قدرت کا خاص ہاتھ ہوتا ہے۔

اس کی نظروں سے بچتے ہوئے آڑ میں جا کر میں نے دیکھا۔ وہ ڈر کر گلیس پوسٹ چھوڑ کر چلا گیا۔ پیچھے پیچھے جا کر دیکھا۔ وہ آدمی گولدیگھی گھس کر تالاب کے کنارے گھاس پہ چت لیٹ گیا۔ میں نے سوچا بڑے کام کے لئے کوئی موزوں طریقہ سوچنے کے لیے یہی بہترین مقام ہے۔ گیس پوسٹ کے نیچے کی بنسبت یہ جگہ بہت ہی اچھی ہے۔ یہاں اگر کوئی آدمی شک بھی کرے۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتا ہے۔ کہ یہ نوجوان اپنی معشوقہ کی بیوفائی سے نالاں ہو کر یہاں اندھیرے میں آ کر اس کی یاد سے بیتاب ہو کر آنسو بہا رہا ہے۔ اس آدمی کی طرف میرا دھیان زیادہ ہونے لگا۔

بہت تلاش اور کوشش سے اس کے گھر کا پتہ لگایا۔ اس کا نام شنکر ہے۔ کالج کا طالب علم ہے۔ امتحان سے فیل ہو جانے کے

باعث گرمیوں کی چھٹیوں میں اِدھر اُدھر گھومتا رہتا ہے۔ اس کے ڈیرے میں اس کے ساتھ رہنے والے طلباء اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں۔ ملبی تعطیلات میں اکثر سبھی طلبا، اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ میں نے یہ معلوم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کہ اس لڑکے کو کونسی بلا گھر جانے نہیں دیتی۔

میں ایک طالب علم کی حیثیت سے اس کے ڈیرے میں ایک کمرے میں رہنے لگا۔ پہلے جب اس نے میری طرف دیکھا۔ تو نہ جانے کون سے خیال سے میری طرف تاکا۔ اس کے اس خیال کو میں سمجھ نہ سکا۔ میں نے خیال کیا۔ کہ اس نے میرے مقاصد کو بھانپ لیا ہے قابل شکار ——— یہ شکاری آسانی سے ہاتھ نہیں آئیگا۔

لیکن ظاہری طور پر جب میں نے اس سے دوستی کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ تو بآسانی میرے ہاتھ آ گیا۔

مجھے بنیے سمجھنے میں اس نے کوئی ہچکچاہٹ وغیرہ کا اظہار نہ کیا۔ لیکن مجھے احساس ہوا۔ کہ وہ مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ مجھے پہچاننا چاہتا ہے۔ انسان کو اپنے دشمن سے ہل مل جانا۔ لیکن ہمیشہ اس پر کڑی نگاہ رکھنا۔ اور کبھی اس کے قابو نہ آنا بھی ایک طرح سے استادانہ چال ہے۔ اتنی تھوڑی سی عمر میں اتنی ہوشیاری اور چالاکی دیکھکر میں بہت خوش ہوا۔

میں نے دل میں سوچا۔ ایک عورت کو بیچ میں ڈالنے کے سوا اس
نوجوان کے دلی راز کا پانا آسان کام نہیں ہے۔ ایک دن میں نے نہایت
محبت اور ہمدردانہ انداز سے کہا۔ بھائی شنکر میں ایک عورت کو
چاہتا ہوں۔ لیکن وہ مجھے نہیں چاہتی۔

پہلے جیسے چونک کر اس نے میری طرف دیکھا۔ پھر ہنس کر کہا۔ اس
بگھڑی شے کو بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسی قسم کے تماشے کرنے کے
لئے قدرت نے عورت مرد کو اس دنیا میں بھیجا ہے۔

میں نے کہا۔ اس سلسلہ میں میں تم سے صلاح اور امداد چاہتا ہوں
اور وہ راضی ہو گیا۔

چنانچہ اس عورت کے بارے میں بہت سی باتیں بنا بنا کر کہیں۔ نہایت
دلچسپی کے ساتھ شنکر نے سب باتیں سنیں۔ لیکن جواب میں خود
اس نے زیادہ باتیں نہ کہیں۔ میری رائے تھی۔ کہ نوجوان سے لڑکیوں
کی محبت اور رنگین ملاقاتوں کا ذکر کرنا۔ ان کے جذبات کو ہوا دیتا ہے
لیکن یہاں مجھے اس کیلئے کوئی آثار نہ دکھائی دیئے۔ وہ چھوکرا پہلے سے
بھی زیادہ خاموش رہنے لگا۔ بعد میں یہ معلوم ہوا۔ کہ اس نے سب
باتوں کو اپنے دل میں ذہن نشین کر لیا۔ مجھے چھپ کر اس کی اس چالاکی کو دیکھ
کر بڑی خوشی ہوئی

ادھر میں اس کا کچھ بھی پتہ نہ لگا سکا۔ کہ روزانہ دروازے کو بند کر کے

شنکر اپنے کمرے میں کیا کرتا ہے۔ اور اس کی وہ خفیفہ کارروائی کہاں تک ترقی کر چکی ہے۔ لیکن اس کوئی شک نہیں۔ کہ وہ کسی راہ میں دن بدن آگے بڑھ رہا ہے۔ اس نوجوان کا چہرہ دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ وہ کسی خاص پوشیدہ معاملے کی طرف راغب ہے۔ اور اس وقت وہ عالم بالکل پکا ہو چکا ہے۔ میں نے چھپ کر کنجی سے اس کا بکس کھولا۔ اس میں سے شاعری کی کاپی۔ کالج کے لیکچروں کے نوٹس اور گھر کے آدمیوں کی معمولی... چٹھیاں دیکھ پڑیں۔ اور کچھ نظر نہ آیا۔ گھر کی چٹھیوں سے اسی بات کا ثبوت ملا۔ کہ عزیز و اقربا نے کئی بار اسے گھر آنے کے لئے لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کے گھر نہ جانے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ وہ اگر کوئی عام وجہ ہوتی۔ تو آج تک بات چیت میں مجھے یقیناً اس کا علم ہو جاتا۔ لیکن اس چھوکرے کا اس طرح خاموش خاموش رہنا۔ بہت کم بات کرنا۔ اور سنجیدہ ہونے سے مجھے اس کے چال چلن میں ایک نرالی بات دکھائی دیتی تھی۔ کوئی دیوتا جس طرح پاتال کے نیچے بیٹھ کر اس دنیا کے لوگوں کو اپنی طرف نیچے کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور وہ اپنی اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس نوجوان کا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھپا کر اہل دنیا کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ یہ لڑکا کالج کا معمولی طالب نہیں۔ یہ دنیا میں آنیوالی قیامت کا پیغامبر ہے۔ آج کل عینک لگائے۔ اور ماڈرن ہیٹ لباس میں کالج میں

میں پڑھتا ہے۔ میری رائے ہے اگر یہ آدمی کسی سادھو یا فقیر کے لباس میں ہوتا۔ تو اس کا ظاہرا موجودہ کیطرح اتنا خوفناک نہ ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس لڑکے کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھتا ہوں۔

بالآخر مجھے عورت کو لانا پڑا۔ پولیس سے باقاعدہ تنخواہ پانے والی ایک طوائف میری امداد کے لئے تیار ہوئی۔ میں نے شنکر کو بتایا۔ کہ میں اس عورت کا بدنصیب عاشق ہوں۔ اسی کیلئے کچھ دنوں تک شنکر کیساتھ گولدیدھی کے کنارے۔ سے

ع۔ جاتی ہے جس پہ جاں مری یہاں تم ہی تو ہو۔

غزل گاتا رہا۔ اس طوائف نے بھی امداد کرتے ہوئے کچھ دل سے اور کچھ ڈھونگ سے . . . کہا کہ میں نے اپنا سب کچھ شنکر کی نذر کر دیا ہے۔ لیکن جیسی امید تھی۔ ویسا کام نہ بنا۔ شنکر دور ہی رہ کر گھور گھور کر اس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔

اسی طرح ایک دن دوپہر کے وقت شنکر کے کمرے سے ایک پھٹی ہوئی چٹھی کے کچھ پرزے ملے۔ ان پرزوں کو ملا کر کچھ مفہوم سمجھنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ سمجھ نہ آیا۔ بہت دیر کی محنت کے بعد یہ نامکمل جملہ میں پڑھ سکا "آج شام کو سات بجے چھپ کر تمہارے ڈیرے میں ہاں" ۔ پورے مضمون کو پڑھنے کی میں نے بہت کوشش کی۔ لیکن سب ناکام۔

لیکن اس کے باوجود خوشی سے میرا دل جھپک اٹھا۔ مبنی کے تہ میں سے کسی ایسے آدمی کی ہڈی پاکر جس کا خاندان اب دنیا میں نہ رہا ہو۔ جو خوشی پرانی تاریخ کے شیدائی اور محقق کو ہوتی ہے۔ اسی خوشی کا احساس مجھے ہُوا۔

میں جانتا تھا۔ کہ آج رات کو اس ڈیرے میں ہمارا نہ وہ طوائف نہیں نچنے آنے والی ہے۔ لیکن بیچ میں یہ ساعت نچنے والا کیا معاملہ نظر پڑا ہے۔ میں نے دل میں کہا۔ لڑکا دیکھنے میں جتنا سنجیدہ ہے۔ عقل میں بھی انتخاب ہے۔ دیکھو اگر کوئی مجرمانہ حرکت کرنی ہو۔ تو جس دن گھر میں دیگر کوئی بات ہونے والی ہو۔ اسی دن ایسا کام کیا جاتا ہے۔ تاکہ دیکھنے والوں کو شک نہ ہو۔ کیونکہ اس عام چیز کی روشنی اس مجرمانہ کام پر اندھیرا سا پڑ جاتا ہے۔

اچانک مجھے یہ شک ہوا۔ کہ میرے ساتھ اس نئی روشنی اور اس طوائف سے راد وہ ہم بڑھنے کو شنکر نے اپنی کامیابی کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو دور بھی رکھتا ہے۔ اور الگ بھی نہیں ہوتا۔ میں نے اسے اس ہنگامہ خفیہ کام سے الگ کر رکھا ہے۔ میں تو یہی خیال رکھتا ہوں۔ کہ ہم لوگوں سے اچھا ہوا ہے وہ خود بھی اس بے خبر جرم کو دور کرنا نہیں چاہتا۔

میرے خیالات پر۔ ذرا غور کیا جائے۔ کوئی طالب علم جو کسی دور

دراز کے شہر سے پڑھنے کے لئے آیا ہو۔ چھٹیوں میں اپنے عزیز و اقربا
کی درخواستوں کو جو ٹھکرا جو اپنے وطن نہ جائے۔ اور سارا سارا دن
اپنے سونے اور اکیلے مکان میں اکیلا پڑا رہے۔ اس میں کوئی خاص بات
پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نام بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں نے
اس کے ڈیرے میں آکر اس کا طرح ایسے بستر پڑے رہنے کا سلسلہ
بالکل منقطع کر دیا ہے۔ اور بیچ میں ایک طوائف کو لا کر ایک نیا بکھیڑا بھی
کھڑا کر دیا ہے۔ مگر اتنے پر بھی اسے کسی طرح کی کھینچ نہیں ہے۔ وہ
اپنے موجودہ۔ مکان کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ہم سے دور نہیں رہتا۔
لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ کہ اسے میرے اور طوائف پر رتی بھر
بھی اعتقاد یا اعتبار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کئی بار آزمانے کے بعد
میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ دن بدن اس کے دل میں نفرت کا جذبہ
بڑھتا جا رہا ہے۔

اس کا مختصر سا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ کہ لوگوں میں شرفا کی طرح
رہ کر عوام سے مستفید ہونے کے لئے مجھ ایسے نئے خیالات کے
آدمی کو پاس رکھنا ہی بہترین دانشمندی ہے۔
اور کسی دیگر موضوع کی طرف راغب ہو جانا۔ عورت کی مانند دوہرا
نہیں ہو سکتا۔ پہلے شنکر کا رویہ جیسے لبے دھڑک۔ اور خالی از شوگ
تھا۔ ہمارے آنے پر ویسا نہیں رہا۔ لیکن اتنی بڑی بات۔ ایک نحوہ میں

ہی ہنو چکرہ اس پر عمل کرنیوالا ہمارے ہندوستان میں بھی پیدا ہو سکتا ہے - یہ سوچکر جوش مسرت سے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ شنکر اگر کچھ خیال نہ کرتا۔ تو شاید میں اسے دونوں ہاتھوں سے گلے لگا لیتا۔

اس دن شنکر سے ملاقات ہوتے ہی میں نے کہا۔ آج شام کو سات بجے ہوٹل میں تمہاری دعوت کرنے کا خیال ہے" سن کر پہلے تو جیسے وہ چونک پڑا۔ اس کے بعد اپنے آپ کو سنبھال کر اس نے کہا" بھائی معاف کرو۔ آج میری طبیعت کچھ خراب ہے۔ ہوٹل میں کھانا کھانے کیلئے۔ کبھی بھی کسی بھی وقت شنکر نے آج تک انکار نہیں کیا تھا۔ لیکن آج کے اس کے جواب کو سن کر یقین ہوتا ہے۔ کہ شام کے سات بجے وہ کوئی خاص کام کرنے والا ہے

میں اس دن شام کے پہلے کہیں جانے کیلئے شنکر کو کہہ چکا تھا۔ لیکن تیسرے پہر باتوں کا ایسا سلسلہ میں نے شروع کر دیا۔ کہ جم کر بیٹھ گیا۔ اٹھنے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ شنکر دل ہی دل میں بیتاب ہو ہو اٹھا۔ میں جو کہتا تھا۔ اسی میں ہاں کر دیتا تھا۔ میری کسی بھی بات سے اس نے اختلاف نہیں کیا۔ بالآخر گھڑی کیطرف دیکھکر بیتابی کیساتھ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بولا۔ کیوں اس طوائف کو آج لینے نہ جاؤگے۔ میں نے جیسے چونک کر کہا۔ ہاں میں تو بھول ہی گیا۔ تم کھانے وغیرہ

کا بندوبست کر رکھو۔ میں ٹھیک ساڑھے دس بجے لے آؤں گا۔ وہ یہیں وہاں سے چلا گیا۔

میرے جسم کے خون میں خوشی کا نشہ لہرانے لگا۔ شام کو سات بجے جیسے عجیب و غریب تغیر مجھے دکھائی دیا۔ اس سے کم میرے دل میں نہیں تھا۔ میں اس کے ڈیرے کے قریب چھپ کر اس ہوا نذف کے آنے کیلئے گھڑی نکال نکال کر نہایت بیتابی سے دیکھنے لگا۔ تمام کا اندھیرا گھنا ہو جانے کے بعد جب سڑک پر کہیں روشن ہونے کا وقت آیا۔ تب ایک پالکی جس کے دروازے بند تھے۔ شنکر کے ڈیرے میں لا کر پلنگ کے اندر رکھی گئی۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں عجیب و غریب خیالات اٹھنے لگے۔ کہ اس بند پالکی کے اندر۔ ایک کالج کی طالبہ عشق کی مریض بے خود کہاروں کے کندھے پر نہایت عزو جلال سے اس چھوکرے کے ہاں آرہی ہے۔

میں اب انتظار نہ کر سکا۔ ویسے ہی دھیرے دھیرے سیڑھی پر چڑھ کر اوپر دو منزلے پہنچا۔ خواہش تھی۔ کہ چھپ کر سب کچھ دیکھوں گا لیکن ویسا نہ کر سکا۔ کیونکہ سامنے میری طرف منہ کئے شنکر بیٹھا ہوا تھا۔ اور گھونگھٹ کاڑھے ہوئے ایک عورت نہایت آہستہ آہستہ اس سے باتیں کر رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا۔ کہ شنکر نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ تب جلدی سے کمرے میں گھس کر میں نے کہا۔ بھائی میں اپنی

گھڑی یہیں بھول گیا تھا۔ وہی لینے آیا ہوں۔
مجھے دیکھکر شنکر ایسا گھبرا گیا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ وہ ابھی بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے گا۔ میں نے محبت آمیز جذبے سے کہا۔ بھائی کیا تمہاری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ تب کاٹھ کی پتلی کیطرح بیٹھی ہوئی اس عورت کیطرف متوجہ ہو کر میں نے پوچھا۔ تم شنکر کی کون ہوتی ہو۔
لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اور میں نے دیکھا۔ کہ وہ شنکر کی کوئی نہیں میری اپنی بیوی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ وہ سب آپ لوگ جان سکتے ہیں یہی میری پہلی جاسوسی ہوئی ہے۔
کچھ دیر بعد گھر آکر میں نے اپنے دل میں کہا۔ میری بیوی کیساتھ شنکر برا نہیں بھی ہو سکتا۔ اس وقت طاق پر رکھی ہوئی ایک چٹھی پر میری نظر پڑی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ اس کی نقل یہ ہے۔

بہن۔

بدنصیب شنکر کی بات شاید اتنے دنوں میں تم بھول بھی گئی ہوگی۔ بچپن میں جب میں ماموں کے ہاں رہتا تھا۔ تب ہمیشہ تمہارے گھر جا کر تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا لیکن کچھ دنوں وہ حالت بھی گزر گئی۔ تم کو معلوم ہو یا نہ ہو میں نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھکر تمہارے ساتھ شادی

کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن ہمارے تمہارے گھر کے اشخاص اس رشتہ کے لئے راضی نہ ہوئے۔

پھر تمہارا بیاہ ہو گیا۔ چار پانچ برس تک تمہارا حال معلوم نہ ہوا۔ آج پانچ ماہ ہوئے۔ مجھے خبر ملی۔ کہ تمہارے خاوند پولیس کی جاسوسی برانچ میں ملازم ہو کر کلکتے چلے گئے ہیں۔ میں بھی کلکتہ کے ایک کالج میں پڑھ رہا ہوں۔ یہاں میں نے تمہارے گھر کا پتہ لگا لیا ہے۔

تمہارے ساتھ ملاقات کرنے کی خواہش مجھے نہیں ہے۔ جو نیچ لوگ جانتے ہیں۔ کہ تمہارے گرہست کے سکھ میں ایک چھلاوے کی طرح گھسنے کی بھی میری نیت نہیں ہے۔ شام کے وقت تمہارے گھر کے سامنے کے ایک گیس پوسٹ کے پاس میں کھڑا رہتا ہوں۔ تم ٹھیک ساڑھے سات بجے ایک لیمپ جلا کر اپنے اوپر کے کمرے کی کھڑکی کے پاس رکھ آتی ہو اسی وقت دم بھر کے لئے تمہارے درشن پا کر اپنے کو خوش نصیب خیال کرتا ہوں۔ اتنا گناہ مجھ سے ضرور ہوتا ہے۔

اسی دوران میں اچانک تمہارے خاوند سے ملاقات اور آہستہ آہستہ دوستی بھی ہو گئی ہے۔ ان کا رنگ ڈھنگ جیسا میں نے دیکھا ہے۔ اس سے مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ کہ تم سکھی

نہیں ہو۔ تمہارے اوپر میرا کوئی سا ماجک حق نہیں ہے۔ لیکن جس قدرت نے تمہیں دکھ دیا ہے۔ اس نے وہ دکھ دور کرنے کا کام مجھے سونپ دیا ہے۔

نیازمند

شنکر ——— دیال

چٹھی پڑھنے میں میرا سب شک رفع ہو گیا۔ جاسوسی میں شہرت حاصل کرنے کی خواہش۔ اور وہ نوکری بھی میں نے چھوڑ دی۔

ہچکیاں

دکھی رام اور کلو دونوں بھائی جب زمیندار کے یہاں بیگار میں کام کرنے کے لئے "کھرپا" ہاتھ میں لئے گھر سے نکلے۔ تب ان دونوں کی عورتیں چلا چلا کر زور زور سے لڑائی کر رہی تھیں ......

اڑوس پڑوس کے لوگوں کو ان کی لڑائی جھگڑے سننے کی عادت ہو گئی تھی۔ ان کے جھگڑے کی آواز سن کر کہتے ہیں "یہ لو ٹھن گئی" ......

جیسی امید کیجا سکتی ہے۔ ویسا ہی ہوا۔ آج بھی اس اصول میں کسی طرح کی تبدیلی وغیرہ نہ ہوئی۔ صبح کیوقت آفتاب طلوع ہونے پر جیسے اس کی کوئی وجہ نہیں پوچھتا۔ اسی طرح ان عورتوں کے ہاں لڑائی ٹھن جانے پر کوئی بھی اس کی وجہ پوچھنے کی تکلیف یا کوشش نہیں کرتا۔

اس روز روز کی بک بک کے بارے میں کئی پڑوسیوں نے ان عورتوں خاوندوں سے بات چیت کی تھی۔ اور اس چیز کے بند کرنے کی صلاح بھی تھی۔ لیکن ان دو بھائیوں پر یہ لڑائی کبھی اثر انداز نہ ہوئی وہ دونوں بھائی جیسے ایک ایکے پہ سوار ہو کر دنیا کا راستہ طے کر رہے تھے۔ وہ ٹوٹے ہوئے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کو جیسے انہوں نے زندگی کے سفر میں ایک خوش گفتار ساتھی مان لیا تھا۔

جس دن گھر میں کسی قسم کی لڑائی وغیرہ نہ ہوتی۔ سناٹا سا رہتا تھا۔ اس دن انہیں یہ کھٹکا دامنگیر ہو جاتا۔ کہ گھر پر کوئی بڑی بھاری ہی آفت نہ آجائے۔

اس کہانی کے واقعات جس دن شروع ہوئے۔ اس دن شام سے پہلے دونوں بھائی تھکے ہوئے بیگار بھگت کر آئے تھے۔ انہوں نے دیکھا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

گھر کے باہر بھی مکمل سکوت تھا۔ دوپہر کے وقت خوب پانی برس چکا تھا۔ اور اس وقت بھی آسمان بادلوں سے بھرپور تھا۔ مگر ہوا کہیں سنسناتی بھی نہ تھی۔ برسات کا موسم ہونے کے باعث گھر کے چاروں طرف گھاس پوس کا جنگل خوب بڑھ رہا تھا۔ پانی میں ڈوبے ہوئے پاٹ کے کھیتوں میں۔ پاٹ سڑنے کی بدبو آرہی تھی۔ اس بدبو مضبوط سی دیوار گھر کے چاروں طرف محیط تھی۔ گھر کے پچھواڑے پانی کے ایک بھرے ہوئے گڑھے میں مینڈک ٹرٹر کر رہے تھے۔ اور جھینگر کی جھنکار سے جیسے آسمان گونج رہا تھا۔

گھر سے تھوڑی دور پدما ندی بہت ہی بڑھی ہوئی تھی۔ بادلوں کے اندھیرے میں وہ نہائت سخت ہو کر تیزی سے بہ رہی تھی۔ ندی کے کنارے کے آم اور پیپل وغیرہ کے اشجار اکھڑ کر زمین پر آرہے تھے۔ ان کی جڑیں پانی میں ڈوب کر صاف ستھری۔ اور کھل گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے درختوں کی وہ ننھی ننھی جڑیں بہتے ہوئے پانی میں کوئی نامعلوم سا سہارا پکڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

دکھی رام اور کلو اس دن زمیندار کے ہاں کام کرنے گئے تھے

ندی کے کنارے کھیتوں میں وھان پک چکے تھے۔ برسات میں باڑھ آنے کے پہلے ہی لوگ اپنے کھیت کے وھان کاٹ لاٹے گئے لے گئے ہوئے تھے۔ صرف انہیں دونوں بھائیوں کو زمیندار کے سپاہی زبردستی بیگار میں پکڑ لے گئے۔ زمیندار کی بیٹھک میں چھت پر کہیں کہیں پانی ٹپک رہا تھا۔ اسے ٹھیک کرنے اور ایک چھوٹا سا نیا چھپر بنانے میں ہی سارا دن صرف ہو گیا۔ دونوں بھائی دوپہر کیوقت بھی گھر نہیں آسکے۔ انہیں سے دو چار تھپے مل گئے تھے۔ بیچ بیچ میں بارش ہونے کے باعث پانی میں بھی بھیگنا پڑا۔ شام کو پوری مزدوری بھی نہ ملی۔ اس کے بدلے سپاہیوں نے جی بھر کر گالیاں دے کر ان غریبوں کا پیٹ بھر دیا۔

راہ کے کیچڑ اور جگہ جگہ پانی سے ہوتے ہوئے شام کو دونوں بھائی گھر آئے۔ گھر آکر انہوں نے دیکھا۔ کلو کی عورت سکھیا چپ چاپ زمین پر پڑی ہوئی ہے۔ آج کی بارش کی طرح وہ بھی لا انتہا آنسو بہا کر غصے میں بھری پڑی ہوئی تھی۔ اور دکھی رام کی بیوی روھیا بھی منہ پھلا رہی کے آنگن میں بیٹھی تھی۔ اس کا ڈیڑھ برس کا چھوٹا بچہ رو رہا تھا۔ دونوں بھائی جب گھر میں گھسے۔ تو انہوں نے دیکھا۔ وہ بچہ آنگن میں ایک طرف پڑا سو رہا ہے۔

بھوک سے بیتاب دکھی رام نے آتے ہی اپنی بیوی سے پوچھا۔

روٹی دے۔

جیسے بارود کی کھتیلی میں آگ پڑ جائے۔ ایسے ہی ماتھے پر شکن لائے ہوئے نہایت غصہ بھری آواز سے رودھیا نے کہا۔ روٹی کہاں ہے جو تجھے دوں۔ تو کیا آٹا مول لے کر رکھ گیا تھا۔ میں کیا کما کر لاتی۔ جو اس وقت تیرے لیئے روٹی تیار کر رکھتی۔

دن بھر تھکنے اور گالی کھانے کے بعد گھر میں آنے پر عورت کے ایسے روکھے الفاظ سن کر بھبوکا دکھی رام نہ سہہ سکا خاص کر کما کر لانے کی بات نے اس کے کلیجے میں جیسے برچھی سی گھونپ دی تھی۔

جنگلی شیر کیطرح گرج دکھی رام نے کہا۔ کیا کہا رہی۔ اور پھر بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے وہی ہاتھ میں پکڑا ہوا کھرپا عورت کے سر پردے مارا۔ رودھیا اپنی دیورانی کے پاس ہی گر پڑی۔ گھڑی بھر میں دیکھتے ہی دیکھتے اس کی موت ہو گئی۔

رودھیا کے خون سے سکھیا کے کپڑے تر بتر ہو گئے۔ یہ حال دیکھ کر وہ چلا اٹھی۔ دکھی رام کھرپا کر پھینک کر سر پکڑ کر جہاں کا تہاں بیٹھ گیا۔ اس گڑبڑ میں اس کا چھوٹا بچہ جاگ پڑا۔ ڈر سے وہ بھی رونے لگا۔

باہر اس وقت بھی پوری پوری خاموشی تھی۔ چرواہوں کے لڑکے گائے بھینسیں چرا کر واپس لوٹے آرہے تھے۔ ندیا کے اس پار۔ جو لوگ دھان کاٹنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ کاٹتے ہوئے دھان

کو کشتی میں رکھکر اور خود سوار ہو کر اس پار آ رہے تھے۔

منشی لوچن رام اس وقت گاؤں کے ڈاک گھر میں چھٹی چھوڑ کر بے کھٹکے دروازے کے باہر بیٹھے تمباکو پی رہے تھے۔ اچانک انہیں خیال آیا۔ کہ ان کی آسامی دکھی رام پر ان کا بہت سا روپیہ باقی ہے پچھلے کئی ماہ سے اس نے سود بھی نہیں دیا۔ آج اس نے کچھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب وہ مزدوری کر کے گھر واپس آ گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر دکھی رام کے گھر کیطرف چلے۔

کوریوں کے گھر کے سامنے آتے ہی ان کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ گھر کے اندر گھس کر منشی جی نے دیکھا۔ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اندھیرے میں ہی منشی جی نے دور سے دیکھا۔ کچھ آدمی اکٹھے بیٹھے ہیں۔ رہ رہ کر آنگن کے ایک کونے سے کسی کے سسک سسک کر رونے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی پڑتی ہے۔ اور چھوٹا بچہ جتنا ہی لمبا لمبا اور زور سے رونے کی کوشش کرتا ہے۔ اتنا ہی کوئی اس کے منہ کو دبا کر چپ کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

رام لوچن نے کچھ ڈر کر پکارا۔ دکھیا۔

دکھی رام اس وقت تک کاٹھ کی پتلی کیطرح بے حس و حرکت چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ اپنے نام کی آواز سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کلو جلدی سے آنگن میں منشی جی کے پاس آ گیا منشی جی نے کہا۔

جان پڑتا ہے۔ عورتوں میں آج پھر لڑائی ہوئی ہے۔ کیوں نہ۔
اب تک کلو بہت سوچنے کے باوجود بھی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ کہ اب
اسے کیا کرنا چاہیئے۔ سیما کی متحرک تصاویر کی مانند کئی خیالات اس کے
شیشۂ دل پر آرہے تھے۔ بالآخر اس نے یہ سوچا کہ زیادہ رات
ہونے پر بھر جائی کی لاش کو وہ کہیں گاڑ دے گا۔ یا ندی میں بہا دے گا۔
اس کے بعد جو ہوگا۔ دیکھا جائیگا۔ لیکن اس نے یہ خیال بھی نہ کیا تھا۔ کہ
اسی بیچ میں منشی رام پوجن آجائیں گے۔ اچانک اس سے کوئی جواب بن پڑا
جواب میں صرف اس نے اتنا ہی کہا۔ کہ ہاں آج خوب جھگڑا ہوا ہے۔
منشی نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ تو اس کے لئے دکھیا
کیوں رو رہا ہے۔
کلو نے بچت کی کوئی صورت نہ دیکھکر جلدی سے کہدیا۔ لڑتے لڑتے
سکھیا نے رودھیا کو سر پکڑ کر رویا ہے۔
ایام عیش ـــــ ایک عیش پرست کو یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا۔
کہ اس پر بھی مصیبت کے بادل آسکتے ہیں۔
کلو نے اس وقت سوچا۔ کہ اس بھیانک سچائی کے ہاتھ سے
اب کسطرح چھٹکارا ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ نہیں سوچا۔ کہ جھوٹ
اس سے بھی بڑھ کر خوفناک ہوگا۔
رام پوجن کا سوال سن کر کلو کو یہی جواب سوجھا۔ کہ اس کی بیوی نے

اپنی جیٹھانی کو مار رہا ہے۔ رام پوجن نے چونک کر کہا۔ ہیں کہتا کیا ہے۔ رودھیا مری تو نہیں۔

بھرائی ہوئی آواز سے۔ "مرگئی"۔ کہہ کر کلو منشی جی کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ منشی کو بھاگنے کی بھی راہ نہ ملی۔ وہ دل میں کہنے لگے۔ شام کیوقت کس مصیبت میں آکر پھنس گئے۔ عدالت دوڑتے دوڑتے جان نکل جائے گی۔ گواہی دینی پڑے گی ——— کلو نے کسی طرح منشی کے پاؤں نہ چھوڑے۔ بولا۔ منشی جی اب سکھیا کس طرح بچ سکتی ہے۔ آپ مہربانی کر کے مجھے راہ پر لگائیں۔

رام پوجن کو گاؤں کے لوگ عدالتی کارروائی کا پنڈت سمجھتے تھے۔ سبھی آدمی اپنے مقدمے میں ان سے صلاح مشورہ لیتے آتے تھے۔ رام پوجن نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔

دیکھ اس کا ایک علاج ہے۔ کہ ابھی تھانے دوڑا ہوا جا کر کہدے کہ تیرے بڑے بھائی دکھیا نے شام کو گھر آکر کھانے کو مانگا۔ کھانا تیار نہ تھا۔ اسی لئے خفا ہو کر اس نے اپنی عورت کے سر پر کھرپا مار دیا ——— میں بھروسہ دیتا ہوں۔ کہ یوں کہنے سے تیری عورت بچ جائے گی۔

کلو کا گلا سوکھ رہا تھا۔ اس نے کہا منشی جی عورت تو پھر بھی مل جائے گی۔ لیکن بھائی پھانسی ہو گیا۔ تو پھر ماں جایا بھائی نہیں

ٹل سکتا۔

لیکن جب کلو نے اپنی بیوی پر جھوٹی تہمت لگائی تھی۔ تب ان باتوں پر غور نہ کیا تھا۔ جلدی میں اس نے کہہ تو دیا۔ لیکن اب اُس کو ایسے بڑا پچھتاوا ہونے لگا۔

منشی جی نے بھی کلو کی بات کو درست سمجھکر کہا۔ تو پھر جو کچھہ ہوا ہے۔ وہی سچ سچ کہدینا۔ عورت اور بھائی دونوں کا بچنا مشکل ہے۔

اب منشی جی سر پر پاؤں رکھکر اپنے گھر کو بھاگے۔ تھوڑی ہی دیر میں گاؤں بھر میں خبر پھیل گئی۔ کہ کلو کی عورت نے اپنی جیٹھا اروبہا کو مار ڈالا ہے۔

بندھ ٹوٹ جانے پر جیسے ندی کا پانی گاؤں میں بھر جاتا ہے۔ ویسے ہی تھوڑی دیر میں پولیس کے سپاہی آکر جمع ہو گئے۔ گنہگار اور بے گناہ سب متفکر اور بے تاب ہو اٹھے۔

(۳)

کلو نے سوچا جو راہ نکالی ہے۔ اسی پر چلنا ہوگا۔ جو بات منشی جی سے میں نے کہی ہے۔ وہی بات گاؤں بھر میں پھیل چکی ہے اور کچھہ کرنے سے نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ کلو نے یہی فیصلہ کیا۔ کہ وہی بات کہہ کر اپنی عورت کو بچانے کے لئے کوئی تدبیر کرنا ہوگی اس نے یہ نہ سوچا۔ کہ ایسا کرنے سے عورت کسی طرح بھی بچ نہ سکیگی۔

کلو نے اپنی عورت کو خون کا جرم اپنے سر لینے کو کہا۔ سکھیا کے سر پہ آسمان جیسے گر پڑا۔ کلو نے اسے ڈھارس بندھا کر کہا۔ تو یہ کہد تجھے کچھ نہ ہوگا۔ میں تمہیں بچا لوں گا۔ کہنے کو تو یہ کہدیا۔ لیکن اس کا گلا سوکھ گیا۔ اور چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

سکھیا کی عمر سترہ اٹھارہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس کا صاف شفاف چہرہ گول گول ہے۔ قد نہ بہت لمبا۔ اور نہ بہت ٹھگنا۔ دوہرے جسم کی وہ عورت خوب مضبوط ہے۔ دنیا کے تمام معاملات میں ایک طرح اسے دلچسپی سی ہے۔

محلے میں جا کر جوان بہو بیٹیوں سے بات چیت کرنا اسے بہت اچھا لگتا ہے۔ بغل میں گھڑا دبا کر جب پانی بھرنے کے لئے وہ گھاٹ پر جاتی ہے۔ تو دو انگلیوں سے اپنے گھونگھٹ کو ہٹا کر راہ کی تمام قابل دید چیزوں کو دیکھ لیتی ہے۔

رودھیا کا رنگ ڈھنگ بالکل اس کے برعکس تھا۔ وہ پرلے درجہ کی ڈھیلی اور سست تھی۔ سر کا گھونگھٹ۔ گود کا بچہ۔ اور گھر کا کام کاج۔ کچھ بھی وہ سنبھال نہ سکتی تھی۔ گھریلو کام کاج میں کبھی اس نے زیادہ دل نہ لگایا تھا۔ یا تو لڑائی لڑتی یا لیٹی رہتی تھی بیچ بیچ میں آہستہ سے ایک آدھ ایسی بات کہہ دیتی۔ کہ سکھیا چلا کر اچھل پڑے۔ بک جھک کر کے محلے بھر کو حیران کر دیتی تھی۔

ان دونوں عورتوں کے مردوں میں بھی بہت فرق تھا۔ دکھی رام
کا ڈیل ڈول لمبا اور جسم کی ہڈیاں چوڑی تھیں۔ ناک قدرے چپٹی تھی
آنکھیں اتنی چھوٹی ——— کہ جیسے اس وسیع دنیا کو بخوبی دیکھ
بھی نہیں سکتیں۔ اور نہ ہی اس دنیا یا دنیا والوں سے کسی قسم کی
گفت و شنید کرنا چاہتی ہیں۔ ایسے اچھے لیکن خوفناک۔ ایسے
مضبوط لیکن بے حس انسان دنیا میں بہت کم دیکھ پڑتے ہیں۔ اور
کلو ——— اسکا جسم سڈول تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی کاریگر
نے بڑی کاریگری سے سیاہ چمکیلے پتھروں سے ایک خوبصورت
مورتی بنائی ہے۔ اس کا ہر ایک عضو مضبوط اور دیکھنے میں دلکش
تھا۔

ندی میں پھاندنے کشتی چلانے۔ بانس کاٹنے۔ غرضیکہ ہر ایک
کام میں اس کا دماغ خوب چلتا تھا۔ اس کے سر کے بال لمبے اور
گھنگھریلے تھے۔ اس کے ہر ایک کام سے شوقینی اور صفائی ٹپکتی تھی۔

گاؤں کی تمام خوبصورت عورتیں اس کی نظر میں تھیں۔ اور اُن
عورتوں میں اپنے کو خوبصورت ظاہر کرنے کی خواہش بھی اس میں کم نہ تھی
لیکن اس سب کے باوجود کلو کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔
دونوں میں جھگڑا بھی ہوتا تھا۔ اور پھر اس کے بعد محبت۔ ہمیشہ

وہ دونوں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کے لیئے کوشاں رہے۔ کلو سمجھتا تھا۔ کہ سکھیا جیسی چنچل اور نوجوان عورت پر پُورا اعتماد کرنا ٹھیک نہیں۔ اور ادھر سکھیا اپنے دل میں سوچتی۔ کہ میرا خاوند رنگین طبع ہے۔ اس کی نظر چاروں طرف رہتی ہے۔ سختی سے اگر اسے قابو میں نہ رکھا گیا۔ تو یقیناً بہت جلد بے قابو ہو جائے گا۔

اوپر بیان کردہ طوفان کے ظہور پذیر ہونے سے چند دن پہلے سے دونوں میں ایک طرح کا جھگڑا چلا آرہا تھا۔ سکھیا نے دیکھا۔ اس کا خاوند کام کا بہانہ کرکے بیچ بیچ میں دور چلا جاتا ہے یہاں تک کہ کبھی کبھی دو دو تین تین دن کے بعد واپس گھر آتا ہے لیکن کچھ کما کر نہیں لاتا۔ آثار اچھے نہ دیکھ کر اپنے اطوار میں بھی اس نے کچھ تبدیلی کر لی۔ وقت بے وقت گھاٹ پر جانے لگی۔ گاؤں کے گلیوں میں چکر لگاتی دکھائی دیتی۔ اور یہاں تک کہ ایک دن اپنے خاوند کے سامنے لالہ بیج ناتھ کے منجھلے لڑکے روپ نارائن کی تعریف کرنے لگی۔

کلو کی بھوک پیاس اور نیند جیسے کسی نے چھین لی۔ روز روز شب اگر اسے دبائے رکھتا۔ گھر سے مزدوری کرنے جاتا لیکن کام میں قطعاً جی نہ لگتا۔ ہر گھڑی اس کا دل عورت کی طرف

کیطرف لگا رہتا۔ ایک دن اس نے اپنی بھاوج کو خوب ڈانٹا
جواب میں بھاوج آنکھیں مٹکا کر بولی۔

وہ عورت تو آندھی کیطرح گھومتی پھرتی ہے۔ اسے اپنے قابو
میں رکھنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں وہ ضرور
سب کے منہ پر کالکھ لگائے گی۔

سکھیا نے کوٹھڑی سے نکل کر آہستگی سے کہا۔ تم کو اتنا ڈر کا ہے
کا ہے۔ بس اتنا کہنا تھا۔ کہ دونوں میں لڑائی چھڑ گئی

کلو نے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا۔ "اب کے اگر تو اکیلی گھاٹ
پر گئی۔ تو تیری ہڈیاں توڑ کر رکھدوں گا"

"میں بھی جاتی ہوں۔ دیکھوں کوئی کیا کر لیتا ہے"۔ کہکر سکھیا
اسی وقت جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

کلو نے لپک کر اس کے بال پکڑ لئے۔ اور گھسیٹ کر کوٹھڑی
میں ڈال دیا۔ اور باہر سے کنڈی چڑھا دی۔

شام کو کام پر سے واپس آکر کلو نے دیکھا۔ کوٹھڑی کا درواز
کھلا ہوا ہے۔ اندر کوئی نہیں۔ سکھیا تین گاؤں پھاند کر اپنے
ماما کے گھر چلی گئی تھی۔ کلو بیچارے کو بہت فکر دامنگیر ہوا۔ بالآخر
اس کے ماموں کے گھر گیا۔ وہاں سکھیا کی بہت خوشامد کی۔ تب
کہیں وہ گھر واپس آئی۔ اب کے کلو نے ہار مان لی۔ اس نے دیکھا

پارے کو جیسے مٹھی میں بند کر کے رکھنا ناممکن ہے۔ اسی طرح مٹھی بھر کی عورت کو ہاتھ میں رکھنا کارے دارد ہے ——— اس کے بعد کلو نے کوئی زبردستی نہ کی۔ لیکن اس کا وقت بہت بے چینی سے گزرنے لگا۔ اس چنچل نوجوان عورت پر اس کا شک سے بھرا ہوا پیار اس کیلئے روحانی کوفت کا باعث ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ یہ عورت مرجائے۔ تو مجھے اطمینان مل سکتا ہے۔ انسان کو انسان سے جسقدر نفرت ہوتی ہے۔ اتنی موت کے فرشتہ سے نہیں۔

اسی دوران میں گھر میں خون کی یہ واردات ہوگئی ——— کلو نے جب سکھیا سے خون کا جرم اپنے سر لینے کو کہا۔ تو وہ پتھر کی مورتی سی ہو کر اسکی طرف تاکنے لگی۔ اس کی کالی کالی آنکھیں۔ کالی آگ کیطرح جیسے چپ چاپ کلو کو جلانے لگیں۔ اسکے جسم کا ہر ایک عضو۔ دل۔ دماغ اور روح جیسے اپنے ظالم خاوند سے چھٹکارا پانے کے لیے کشمکش کرنے لگی۔

سکھیا اپنے خاوند سے متنفر سی ہوگئی ——— کلو نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ تجھ کو کوئی ڈر نہیں ہے۔ اس کے بعد اُس نے یہ سکھا دیا۔ کہ پولیس کے آگے۔ مجسٹریٹ کے روبرو کیا کہنا ہوگا سکھیا نے ان سب باتوں پر کچھ بھی دھیان نہ دیا۔ وہ کاٹھ کی

بے حس و حرکت پتلی کی مانند بیٹھی رہی۔

ہر ایک کام وہی رام — کلو کے بھروسے پر کرتا تھا۔ کلو نے جب سارا قصور سکھیا پر ڈالنے کیلئے کہا۔ تو وہی رام بولا۔ پھر اس کے بچنے کا کیا ذریعہ ہو گا؟" "کلو نے کہا اسے میں بچا لوں گا۔"

بچاری ڈرپل نڈر دل اور موٹی عقل والا وہی رام بے فکر ہو گیا۔

(۳)

کلو نے اپنی بیوی کو سکھا دیا تھا۔ کہ تو کہنا "جیٹھانی لکڑی لیکر مجھے مارنے دوڑی تھی۔ میں داتی لیکر اسے ڈرانے اٹھی۔ اتنے میں اچانک نہ جانے کس طرح داتی اس کے لگ گئی۔" سب رام لوچن کی سکھائی ہوئی بات تھی۔ اس بیان کو ثابت کرنے کیلئے جو کچھ کہنے کی یا ثبوت بہم پہنچانے کی ضرورت تھی۔ وہ سب کچھ اچھی طرح سے کلو نے منشی جی کو سمجھا دیا تھا۔

پولیس آکر تحقیقات کرنے لگی۔ گاؤں کے سب لوگوں کے دلوں میں اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ سکھیا نے ہی اپنی جیٹھانی کا خون کیا ہے سبھی گواہوں سے یہی بات ثابت ہوئی۔ پولیس افسر کے پوچھنے پر بھی سکھیا نے یہی کہا "ہاں میں نے جیٹھانی کا خون کیا ہے"

"کیوں خون کیا؟"

"میں اسے دیکھ نہ سکتی تھی۔ میری اور اس کی نہیں بنتی تھی"

"وہ کچھ کہا سنا ہوتی تھی؟"

"نہیں۔"

"اُس نے تجھے ستایا یا مارا تھا؟"

"نہیں۔"

سکھیا کے ایسے جواب سن کر لوگ دنگ رہ گئے۔ کلو تو ایکدم سناٹے میں آگیا۔ اس نے کہا "یہ سچ نہیں کہتی۔ میری مرحوم بھاوج پہلے ...."

داروغہ نے زور سے ڈانٹ کر کلو کو بیچ ہی میں روک دیا۔ آخر میں جرح کرنے پر بھی سکھیا سے وہی جواب ملا۔ سکھیا نے کسی طرح بھی اسباب کا اقرار نہ کیا۔ کہ اس کی جیٹھانی نے اس پر پہلے وار کیا تھا۔

ایسی ضدی عورت بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک دم پھانسی پر چڑھنے کیلئے تیار ہے۔ کوئی بھی اسے وہاں سے گھسیٹ کر الگ نہیں کر سکتا۔ جیسے دل ہی دل میں وہ اپنے خاوند سے کہہ رہی ہے۔ کہ اب میں تمہیں چھوڑ کر پھانسی کو گلے لگاؤں گی۔ تمہاری راہ کا کانٹا ہٹ گیا۔ تم چین سے رہو۔

سکھیا—— ایک نوجوان چنچل دیہاتی عورت گرفتار ہو کر—— سرِعام گاؤں کی راہ سے بازار کے بیچ سے ہو کر۔ گھاٹ کے کنارے سے ہو کر۔ لالہ بیج ناتھ کے گھر کے دروازے کے قریب سے ہو کر

ڈاک گھر اور سکول کے پاس سے ہو کر۔ سب لوگوں کی آنکھوں کے آگے سے ہمیشہ کیلئے گھر اور گاؤں چھوڑ کر چلی گئی۔ چند ایک لڑکے اسے ایک تماشہ سمجھکر پیچھے پیچھے چلے۔ سکھیا کی جان پہچان اور اس کیساتھ اٹھنے بیٹھنے والی لڑکیوں میں سے کسی نے گھونگھوٹ کے اندر سے۔ کسی نے دروازے کی اوٹ سے۔ اور کسی نے درخت کی آڑ میں ہو کر پولیس کے ہمراہ جانیوالی سکھیا کو دیکھ لیا۔ نفرت حیا۔ اور ڈر سے ان سب کے دلوں میں ایک بجلی سی کوند گئی۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے روبرو بھی سکھیا نے اقبال جرم کر لیا۔ اس کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوا۔ کہ جیٹھانی نے کسی قسم کا ظلم نہ کیا تھا۔

کلو کی گواہی بھی ہوئی۔ اس نے گواہوں کے کٹہرے میں آکر روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ " حضور میری عورت کا کچھ قصور نہیں!" حاکم نے حکم دیکر اس کا رونا بند کرایا۔ اس کے بعد کلو پر الٹے سیدھے سوالات کئے گئے اس نے سچ سچ سارا حال کہہ سنایا۔

لیکن حاکم کو اس کے کہنے پر اعتبار نہ آیا۔ کیونکہ گاؤں کے سب سے زیادہ بڑھے ہوئے چوہدری منشی رام لوچن نے اپنی گواہی میں کہا۔ کہ خون ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں جائے وقوعہ پر گیا۔ گواہ کلو نے سارا حال سچ سچ بیان کر کے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ اور کہا۔ کہ میں اپنی عورت کو کس طرح بچا سکوں گا۔ جواب میں میں نے کچھ اچھا یا برا نہ کہا۔ لیکن

ہوا کہ اگر میں یہ کہوں۔ کہ میرے بڑے بھائی نے کام پر سے آکر اپنی عورت سے کھانے کو مانگا تھا۔ کھانا نہ ملنے پر غصہ میں آکر اس نے داؤ سے وے مارا اور وہ مرگئی۔ تو کیا میری عورت کی جان بچ جائیگی۔" میں نے کہا خبردار حرامزادے عدالت میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہ کہنا۔ اس سے بڑھکر کوئی گناہ نہیں ہے پہلے تو منشی رام لوچن نے سکھیا کی جان بچانے کے لئے کلو کو بہت سی باتیں سمجھائی تھیں۔ لیکن جب دیکھا۔ کہ سکھیا خود ہی اپنے خونی ہونیکا اقبال کر رہی ہے۔ تو انہوں نے سوچا۔ میں سکھیا کے خلاف گواہی دیکر کذب بیانی کے الزام میں اپنے آپکو حوالات میں بند کراؤں۔ جو جانتا ہوں وہی کہنا اچھا —— منشی رام لوچن کی گواہی نے حاکم کے دل میں یہ بات ذہن نشین کرادی۔ کہ سکھیا ہی نے اپنی جیٹھانی کا خون کیا ہے۔ کلو اپنی عورت کو بچانیکے لئے اپنے بھائی پر جھوٹی تہمت لگاتا ہے۔ "مجسٹریٹ نے مقدمہ سشن سپرد کر دیا۔" دنیا کے سب کاروبار اسی طرح چل رہے ہیں۔ کھیتی باڑی۔ زمینداری۔ ہاٹ۔ بازار خرید و فروخت۔ ہنسنا۔ رونا۔ اسیطرح ہو رہا تھا۔ لیکن سکھیا کی نگاہ میں کائنات کا ذرہ ذرہ بدل گیا تھا۔ "پیشی کے دن پولیس کے سپاہی آسامی اور گواہوں کو لیکر سشن عدالت میں حاضر ہوئے۔ عدالت کے احاطہ میں بہت سے آدمی اپنے مقدموں کی پیروی کیلئے آئے ہوئے تھے۔ ایک مقدمہ ہاتھ بھر زمین کی تقسیم کا تھا۔ اس کے لئے ایکطرف نے سات سو روپے روز پر کلکتہ سے ایک نامی بیرسٹر کو بلوایا تھا۔ اور دوسری طرف والوں نے انچاس گواہ حاضر کئے

تھے۔ اسی طرح کتنے ہی آدمی دنیا کی اور سب باتوں کو بھول کر اپنے اپنے مقدمے کی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ کلو مبہیا عدالت میں اس گہما گہمی کو دیکھ رہا تھا۔ عدالت کے احاطہ میں ایک بہت پرانے برگد کے درخت پر ایک کوئل میٹھی بول رہی تھی۔ اُسے عدالت اور اس کے قوانین کا کوئی ڈر نہ تھا۔

چند ایک مقدمات کے بعد سشن جج کی عدالت میں سکھیا کا مقدمہ پیش ہوا۔ جج کے سامنے بھی سُکھیا نے کہا۔

"ایک بات کتنی دفعہ کہنی ہوگی۔ کہتی تو ہوں۔ کہ مَیں نے ہی خون کیا ہے"

جج صاحب نے سمجھا کر اسے کہا۔ جس جُرم کا تم اقبال کر رہی ہو۔ جانتی ہو اسکی سزا کیا ہے۔"؟

سُکھیا نے کہا۔"نہیں"

جج صاحب نے کہا۔" اس کی سزا پھانسی ہے"!

سُکھیا نے کہا"! بس ٹھیک ہے صاحب۔ میں آپکے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے جلدی سزا دیجئے۔

جب کلو گواہی کے لئے عدالت میں لایا گیا۔ تب سکھیا نے اسکی طرف سے منہ پھیر لیا۔ جج نے کہا۔ گواہ کیطرف دیکھ کر بتا یہ تیرا کون ہے"!

سکھیا نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر کہا۔ "میرا خاوند۔"

جج تو اسے پیار کرتی ہے"۔

سکھیا خوب پیار کرتی ہوں"۔

جج کے پوچھنے پر کلو نے کہا۔ حضور خون میں نے کیا ہے"۔

جج۔ کیوں۔

کلو۔ کام پر سے لوٹ کر میں نے کھانے کیلئے مانگا۔ بھاوج نے کھانے کو کچھ نہ دیا۔ اور الٹا بڑبڑانے لگی۔ غصہ سے مجھے اندھا کر دیا۔ اور دانت سے بھاوج کا خون کر دیا"۔

دکھی رام جب گواہی کیلئے عدالت میں حاضر کیا گیا۔ تب وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آنے پر اس نے کہا۔ "جناب خون میں نے کیا ہے۔

جج۔ کیوں۔

جواب میں دکھی رام نے بھی وہی وجہ بتائی۔ جو کلو نے بتائی تھی۔

جرح کرنے اور مختلف گواہوں کے بیانات سننے کے بعد جج کی سمجھ میں یہی آیا۔ کہ گھر کی عورت کو پھانسی سے بچانے کے لئے دونوں بھائی خون اپنے سر لے رہے ہیں۔ جج صاحب کے

ہر دم ہر گھڑی سب کو بنا کہ ہت کہہ کر وہ من خدا نہیں ۔ لیکن خدا کے نور سے آدم جدا نہیں

مالک کون و مکاں کو پانے کا آسان ترین طریقہ

بہشت کی سیڑھیاں

اس کتاب کے مطالعہ سے

ہر شخص صداقت و رحم اور انصاف کی ریلوے لائن پر نیکی کے انجن کیساتھ لگے ہوئے عبادت اور اطاعت کے ڈبہ میں بیٹھکر محبت و شفقت و دیانتداری خوش اخلاقی اور منکر المزاجی کے کمائے ہوئے پیسہ سے سخاوت کا ٹکٹ لیکر سیدھا خدا بے نیاز کی درگاہ عام میں پہنچ سکتا ہے ۔

کتاب اتنی دلچسپ ہے ۔ کہ ایکبار شروع کرکے ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔ ہر بنی نوع کیلئے بلا امتیاز مذہب و ملت اس کا مطالعہ لازمی ہے ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ۔ کاغذ بڑھیا ۔ دلکش جلد گرد پوش ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف عہ علاوہ محصول ڈاک ۔

ملنے کا پتہ :- سردار رنجیت سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب اچھرا بازار راولپنڈی

ایسا سمجھنے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا۔ کہ پولیس سے لے کر سیشن عدالت تک سکھیا نے یہی بیان دیا۔ کہ خون میں نے کیا ہے۔

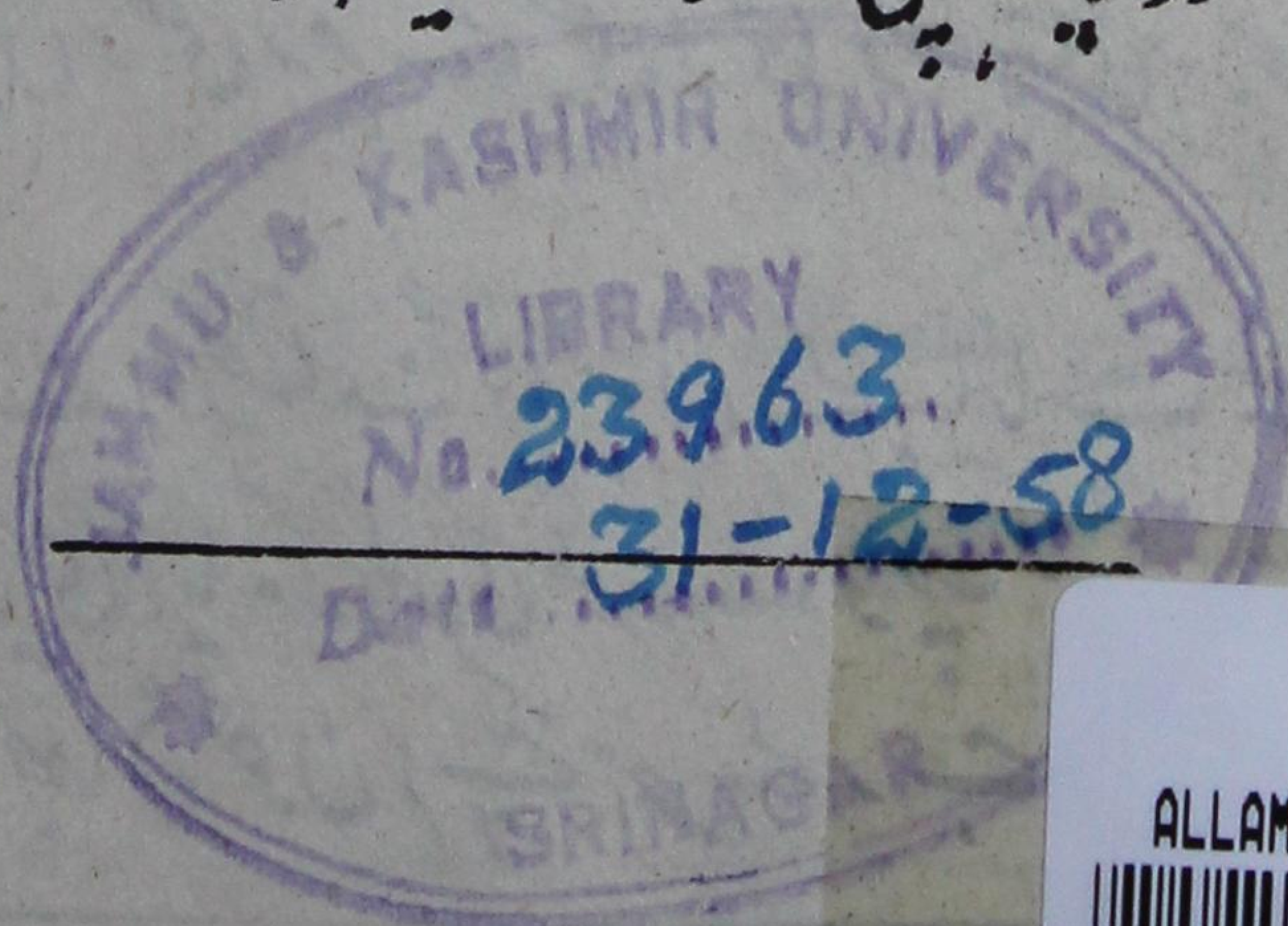
بغیر کسی معاوضہ کے لالچ سے دو وکیلوں نے سُکھیا کو سزائے موت سے بچانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ بھی ہار گئے۔ ان کے بار بار کہنے پر بھی سکھیا نے اپنا بیان نہ بدلا۔

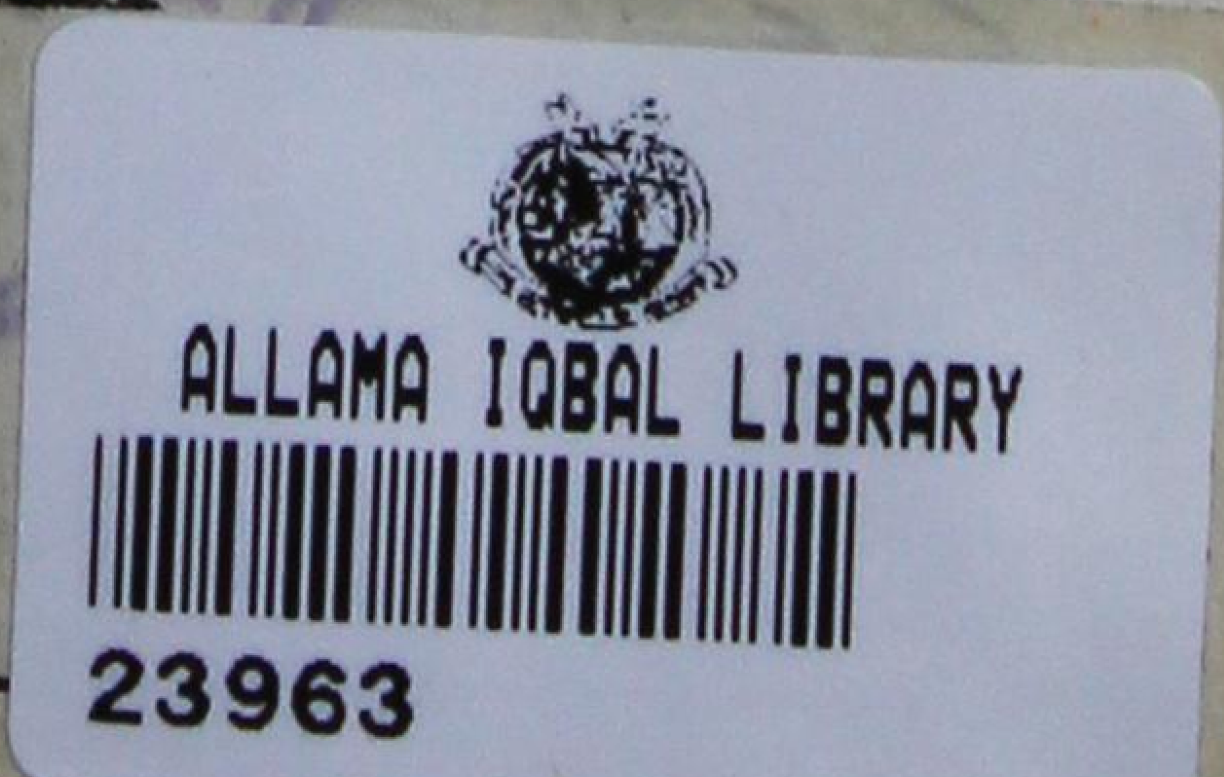
جیل کے رحم دل سول سرجن نے۔ پھانسی سے پہلے سُکھیا سے پُوچھا۔ "کسی کو دیکھنا چاہتی ہو"۔

سکھیا نے کہا۔ "ایکبار اپنی ماں کو دیکھنے کی خواہش ہے"۔

سول سرجن نے کہا۔ "تیرا خاوند تجھے دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ بلا لیا جائے۔ سکھیا نے کہا۔ "کون ——— موت!"

پھانسی کی رسی گلے میں ڈالی گئی۔ مجسٹریٹ کے حکم سے رسی کو کھینچا گیا۔ اور ایک ہچکی کے بعد سکھیا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔


JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY LIBRARY No. 23963 Date 31-12-58 SRINAGAR


ALLAMA IQBAL LIBRARY 23963

اردو ادب میں اپنی وضع کی نرالی کتاب

شائقین فلم کی دلچسپیوں میں ایک قابل قدر اضافہ

فلمی پرستان

از ہر بھگوان صاحب شاد

اس کتاب میں ہندوستان کی قریباً تمام حسین وجمیل اور مشہور و معروف فلم ایکٹرسوں مثلاً رمولا - لیلا ڈیسائی - نینا - نسیم بانو - ممتاز شانتی - نور جہاں - منورما - راگنی - اختری - رینوکا دیوی - پروتما گپتا - کانن روپ لیکھا - دیوکا رانی - مہتاب - واسنتی - خورشید - درگا کھوٹے - کجن - سلوچنا - لیلا دیوی وغیرہ کے مکمل حالات زندگی - ہندوستان کے نامور فلمی ادباء کے ان سے انٹرویوز کے دلچسپ حالات - ایکٹرسوں کے دلکش و رنگدار لاک کے فوٹو کے علاوہ لمحات فرصت میں ان کے مشاغل انکی فلمی اور پرائیویٹ زندگی کے علاوہ وہ وہ رازہائے سربستہ بے نقاب

کئے گئے ہیں جن سے عوام بالکل ناواقف ہیں۔

کیا شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو فلمی دنیا میں شامل ہونا چاہیئے؟

یہ سوال آج ہر پڑھے لکھے ہر فرد و بشر کے سامنے ہے۔ ملک کے فلمی جرائد اس موضوع پر عرصہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن قطعی فیصلہ تک آج تک کوئی نہیں پہنچا۔

"فلمی پرستان" میں ہر ایک ایکٹرس کی رائے اس سلسلہ میں درج کی گئی ہے۔ اس اہم ترین سوال کے جواب میں آسمان فلم کے درخشندہ ستاروں کی مختلف آراء نے کتاب کی دلچسپی میں گرانقدر اضافہ کر دیا ہے۔ اس موضوع پہ اس سے بہتر کتاب آپ کو ہرگز نہیں مل سکتی۔

زر کثیر صرف کر کے کثیر تعداد میں شائع کی جا رہی ہے لیکن اس کے باوجود بھی آپ اپنی کاپی کے لیئے اپنی پہلی فرصت میں انتظام کر لیں۔ ورنہ آئندہ ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

ناشران

سردار رنجیت سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب راجہ بازار راولپنڈی

کے علاوہ آپکے شہر کے تمام بڑے بڑے کتب فروش بیچتے ہیں۔

مرد اور عورت کے پوشیدہ تعلقات پر

اردو ادب میں اپنی قسم کی واحد کتاب

فرانسیسی کوک شاستر (باتصویر)

اس موضوع پر بیسیوں کتابیں چھپ چکی ہیں۔ لیکن ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ایسی جامع مکمل اور مفید چیز ہرگز آپ نے نہ دیکھی ہوگی۔

سائنس کی رو سے مباشرت کے طریق غلط طریق سے پیدا شدہ عورت و مرد کی امراض۔ مثلاً جریان۔ سرعت انزال۔ آتشک۔ سوزاک لیکوریا وغیرہ کے قدرتی اور بے ضرر طریقہ علاج کو اس خوبی سے بیان کیا ہے۔ جو صرف پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ صفحات پانچسو صفحے سے زائد۔

قیمت فی جلد عہ

ملنے کا پتہ:۔ سردار رنجیت سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب راجہ بازار راولپنڈی

پنجابی اشعار کے دو نادرالوجود مجموعے

موتیوں کا ڈھیر

(تین حصوں میں)

اس کتاب لاجواب میں استاد میاں مٹھو پشاوری۔ استاد چرنگی راولپنڈی۔ اور پنجابی زبان کے دیگر شعرائے باکمال کے وہ عشقیہ اور صوفیانہ اشعار درج ہیں۔ کہ پڑھکر آپ واہ کر اٹھیں گے۔ ایکبار ضرور پڑھیں۔ ایک حصہ کی قیمت ۳/ تینوں حصوں کے خریدار سے صرف ۸/

انمول ہیرے

پنجابی زبان کے موجودہ دور کے بہترین شعرا... غریب جنید۔ سائیں عشق لہر دلگیر۔ فنافٹ۔ ملکھی۔ گوہر صابر۔ پریم۔ راہی۔ مراد بخش نظامی۔ اور حبیب۔ وغیرہ کے بہترین کلام کیلیے۔ عشقیہ شعروں کا لاجواب مجموعہ پنجابی زبان کے بیتوں کی اس سے بہتر لڑی آپ کو ہرگز نہیں مل سکتی۔

قیمت...... ۴/

ملنے کا پتہ۔ سردار رنجیت سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب راجہ بازار راولپنڈی


راولپنڈی بھر میں سب سے بڑی فرم

سردار رنجیت سنگھ اینڈ سنز

تاجران کتب راجہ بازار

جہاں آپ کو ہر قسم کی مذہبی، اخلاقی کتب مثلاً قرآن مجید، سیپارے، پنجسورہ اور کیلنڈر، ڈائریاں، پتریاں، فلمی گانے، فلمی ناول، ہندو، سکھوں کی مذہبی کتابیں یہ ناول، کوک شاستر تصویریں، و سامان سٹیشنری وغیرہ ہر قسم ارزاں قیمت پر ملتا ہے،

سردار رنجیت سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب راجہ بازار راولپنڈی





THE JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY.

DATE LOANED

Class No. ۸۹۱.۴۳ Book No. [illegible]

Vol. ______ Copy ______

Accession No. ۲۳۹۴۳



ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN